جلد ۱۸ عدد ۴-۳

ولقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ میثاق لاہور

اپریل ۱۹۷۱ء

★

زیر سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

★

مدیر اعزازی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★

مدیر مسؤل

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی-ایس (پنجاب) ایم-اے اسلامیات (کراچی)

★

یکے از مطبوعات

دار الاشاعة الاسلامیة لاہور

کوثر روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون 69522)

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

فہرست

- ایک لمحہ فکریہ ______ ادارہ ۲
- تدبر قرآن ______ مولانا امین احسن اصلاحی
  + تفسیر سورۂ اعراف (۸) — — — — ۴
  + " " " (۷) — — — — ۲۵
- درس حدیث ______ مولانا عبدالغفار حسن ۳۷
- مقالات ______
  + نبوت کے لوازم اور نبی کی ذمہ داریاں — — مولانا امین احسن اصلاحی ۵۲
  + فلسفہ سے تصوف تک — — — پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۶۱
- تاریخ تصوف اسلامی ______ " " " "
  + انتخاب از کتاب اللمع — — — — ۶۵
- غزل ______ پروفیسر محمد منور ۷۹
- ایک اہم اعلان ______ ادارہ ۸۰

اعتذار

'میثاق' کی اشاعت میں اس بار تعطل اسقدر لمبا رہا کہ معذرت کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے ـــــ ادھر حال یہ ہے کہ اب بھی راقم اس کی اشاعت کو جاری رکھنے کے بارے میں مذبذب ہی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اور کچھ نہ سہی اتنا تعاون تو ضرور کریں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے صحیح فیصلے کی توفیق عطا فرمائے اور اگر پرچہ جاری ہی رکھنا منظور ہو تو راہ کے موانع اور مشکلات کو دور فرمائے ۔ آمین ـــــــــ اسرار احمد

دعوتِ توثیقِ عہدِ الست و تجدیدِ میثاقِ ایمان کا علمبردار

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۱۸ ——— شمارہ ۱

—— بابت ——

اپریل ۱۹۷۱ء

زرِ تعاون

فی پرچہ ——— ایک روپیہ

سالانہ ——— دس روپے

شرائطِ ایجنسی

★ ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے

★ پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہوگا

کمیشن ۲۵ فیصد ——— محصول ڈاک بذمہ "میثاق"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

اسلام کے نام لیوا
روشنی ڈالنے سے

اسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ لاہور فون ۶۹۵۲۲

ادارہ

ایک لمحۂ فکریہ

ایک اشتہار کی عبارت ملاحظہ ہو

"۔۔۔ ایرویز میں ایسی ایسی شکایات آتی ہیں جنہیں سن کر ہماری ایرہوسٹسیں شرما جاتی ہیں۔ مانا کہ یہ وہی دلنواز، خدمت شعار ۔۔۔۔ خواتین ہیں جنہوں نے آپ کا دل موہ لیا ہے — مگر آپ ذرا احتیاط کیجیے۔

کل یہ ہوا کہ فرینک اسٹیگر کراچی سے دوبئی گئے تو انہوں نے شکایت کی کہ میرا سفر ایسی حسین، نکھ اور خوبرو ایرہوسٹسوں کی رفاقت میں اتنی جلدی کیوں ختم ہو گیا۔ تو جناب اسٹیگر صاحب! آپ ذرا لندن تک سفر کر کے دیکھیے۔ کویت ایرویز کے سفر میں اور بھی دلچسپیاں ہیں، مثلاً لندن جاتے ہوئے روم کی رنگینیاں، ایتھنز ۔۔۔ دوسرے شہروں کی سیریں جن کے لئے آپ کو ۔۔۔ نہیں کرنا پڑتا — آیئے ہمیں میزبانی کا

—— کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ: ——

- یہ 'دلنواز'، 'خوبرو' اور 'دل موہ لینے والی' خواتین عرب قوم سے تعلق رکھتی ہیں! —— اور
- یہ اشتہار "مملکتِ اسلامیہ عربیہ کویت" کی ایرویز کا ہے جہاں کی حکومت اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر زرکثیر صرف کرتی ہے! اور
- یہ اشتہار نہایت آب و تاب کے ساتھ 'مملکت خداداد پاکستان' کے اس ہفت روزہ جریدے کے کور پر چھپا ہے جو غالباً پورے ملک میں 'اسلام پسند صحافت' کا سب سے بڑا عَلم بن چکا ہے اور پاکستان میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کا بہت بڑا 'داعی' اور 'نقیب' ہے

—— اور ——

- LAST BUT NOT THE LEAST یہ کہ اس اشتہار کے نیچے ایک خاتون کی انتہائی 'داعیانہ' انداز کی تصویر بھی ہے!

—— تو کیا پھر بھی ——

پورے عالم اسلام میں بالعموم اور

—— پاکستان میں بالخصوص ——

اسلام کے نام لیوا طبقات کی مسلسل شکست و ہزیمت کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے لئے طویل مقالات لکھنے کی حاجت ہے؟

بَیِّنُوا تُؤجَرُوا

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ اعراف

(۸)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۱۵۸

جب بات بنی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسر موقع آپ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوا دی گئی کہ اے لوگو، میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ "سب لوگوں کی طرف" بنی اسمٰعیل و بنی اسرائیل، عرب اور غیر عرب سب کی طرف۔ اوپر کی پیشین گوئیوں میں بھی تصریح ہے کہ اگرچہ آپ کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہو گی لیکن آپ کی رسالت سب کی طرف ہو گی۔ اور دنیا کی سب قومیں آپ کی برکات میں سے حصہ پائیں گی۔ اہل عرب پر، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل۔ آپ نے اللہ کی حجت براہ راست قائم کی اور وقت کے ملوک و سلاطین کو بھی آپ نے دعوت دی اور آپ کے بعد اس دعوت و شہادت کی ذمہ داری قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر ڈالی جس کو شہداء اللہ فی الارض کے منصب عالی پر سرفراز فرمایا۔

الذی لہ ملک السموات والارض، یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے جس کا میں رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اسی کے اختیار میں قوموں کا عزل و نصب ہے تو کسی بے جا عصبیت، کسی غلط اعتقاد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے نبی امی رسولؐ پر جس کی پیشین گوئیاں تمہاری اپنی کتابوں

آنحضرت کی بعثت تمام عالم کے لئے ہوئی

میں موجود ہیں ایمان لانے سے گریز نہ اختیار کرو۔

الذی یؤمن باللہ و کلماتہ " میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر حضرت موسیٰ کی پیشین گوئی میں مذکور ہوئی ہے کہ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی لوگوں سے کہے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعوائے نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو۔ یہ تو وہی کچھ تمہیں سنایا جا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آ رہا ہے۔ پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمہیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے۔ دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیشین گوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی کسی حذف یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت برتی تو خدا اس سے اس کا مواخذہ فرمائے گا۔ اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہوگا۔

ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون ۱۵۹

ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بداعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر کے اس گروہ قلیل کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق و عدل پر قائم رہا ہے اور جس کی بدولت بنی اسرائیل کو ان کے جرائم کے باوجود مہلت ملتی رہی ہے۔ یہاں بھی اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ "امۃ" کی تنکیر اس کی قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ "یھدون" اور "یعدلون" مضارع کے صیغے استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جہاں موسیٰ کی قوم میں اسی طرح کے ناہنجار و ناہنجار پیدا ہوئے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، وہیں ان کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی برابر رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہیں یعنی علماء اور قضاۃ دونوں ہی گروہوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروہ، قلیل تعداد میں سہی، ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان کے یہاں ذکر سے ان کی حوصلہ افزائی ہے اور اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ پیغمبر نے یہ اہل کتاب کو جو دعوت دی ہے وہ اسی طرح کے صالحین پر اثر انداز ہوگی اور وہ نبی امی پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت پر وہ تضمین یا تخلیص جو ' الذین یتبعون الرسول ' سے شروع ہوئی تھی، ختم ہوئی اور آگے سلسلہ کلام پھر بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جڑ گیا جو بیان ہو رہی تھی۔

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ (۱۶۰-۱۶۲)

معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں پوری تفصیل سے ان کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ۵۷ - ۶۰ بقرہ۔ لفظ ' اسباط ' پر بھی بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ لفظ ' تقطیع ' یہاں اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا۔ اور اسی اعتبار سے ان کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا لیکن انہوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔

وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِیْهِمْ ۛؕ كَذٰلِكَ ۛؕ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔیْسٍۭ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا

عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (۱۶۶-۱۶۳)

واسألهم عن القرية الاية ' یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کا ذکر بقرہ آیات ۶۵-۶۶ میں بھی گزر چکا ہے وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جو وہاں بیان نہیں ہوئی ہیں۔

واسألهم کا اسلوب زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ 'ھم' سے مراد یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئی ہیں اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے، اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے اس قریہ کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اس کی سزا میں خدا نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ قرآن نے اس قریہ کی اس سے زیادہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ سمندر کے کنارے تھا۔ تورات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرآن کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے یہود اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اس کو جانتے تھے چنانچہ بقرہ میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم في السبت ۶۵ (اور ان کو تو تم جانتے ہی ہو جنہوں نے تم میں سے سبت کے معاملے میں حدود الٰہی سے تجاوز کیا) ظاہر ہے کہ یہود کے رو در رو اسی اسلوب میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ان کے درمیان شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کے اس بیان کی ضرور تردید کرتے۔ بعض لوگوں نے اس کو ایلہ اور عقبہ کے پاس کا کوئی شہر بتایا ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ سمندروں کے کنارے کے شہر، اگر جائے وقوع مناسب ہو تو تجارتی مرکز بن جاتے ہیں اور بہت ترقی کر جاتے ہیں۔ عقبہ کے علاقے کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قدیم زمانے سے شہرہ حاصل ہے۔ حضرت سلیمان کے بحری بیڑے کا مرکز بھی یہی تھا۔ لفظ 'قریہ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ صرف چھوٹی بستیوں ہی کے لئے نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق بڑی بڑی مرکزی آبادیوں پر بھی ہوتا ہے۔

اذ تاتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا ' شرّع ' شارعة کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لئے آیا ہے تو اس سے مراد اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے، ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح آب پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کئے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتے کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ انہوں نے سبت کے دن مچھلیوں سے

شکار کے لئے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لئے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اس معاملے میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورت حال بنی اسرائیل کے لئے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خواہش وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی صورت میں جو چیز چھٹانک بھر نظر آتی ہے خواہش کے غلبہ کی حالت میں وہی سیر بھر نظر آنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ حسن کا اندازہ کرنے میں حسن سے زیادہ حسن نظر کو دخل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی شامت اعمال سے اس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار خدا کے عذاب سے بھی ان کو تنبیہ نہیں ہوئی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔

سورہ مائدہ آیت ۹۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی اسی طرح ہمارے لئے حالت احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت ہوئی اور ہم کو بھی اس طرح کی آزمائش سے بچے رہنے کی تاکید کی گئی جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو کر اپنے کو تباہ کر بیٹھے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا لیبلونکم اللہ بشئ من الصید تنالہ ایدیکم ورماحکم لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم ۹۴ مائدہ۔ (اے ایمان والو اللہ تمہیں کسی ایسے شکار سے آزمائے گا کہ تم خیال کرو گے کہ تمہارے ہاتھ اور نیزے ان کو پالیں گے تاکہ اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں تو جو اس کے بعد حدود سے تجاوز کریں گے ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہے) "تاتیھم حیتانھم یوم سبتھم شرعا" اور "تنالہ ایدیکم ورماحکم" کے الفاظ پر ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر غور کیجئے تو دونوں کی مشابہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

'واذ قالت امۃ منھم الایۃ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے علی الرغم اختیار کی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہیں تھا۔ اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنہوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید

سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم یہ کہ کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے کا کام جاری رہنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ مان ہی جائیں اور اگر مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

اس سے اس ذمہ داری کی حد معیّن ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عائد ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جب داعی اور ناصح یہ فرض کر لیں کہ اب دعوت و نصیحت کا فرض ادا ہو گیا، اس لئے نہ ماننے والوں کو عذابِ الٰہی کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیئے اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کا قدر کرنے والا نہ نکلے عنداللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گذاریں۔ اس مضمون پر مفصّل بحث انفال آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔

عذابِ الٰہی کی گرفت سے صرف نہی عن المنکر کرنے والے ہی بچتے ہیں

'فلما نسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء' یعنی جب وہ تنبیہات جو انہیں کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے سمجھنے پر راضی نہ ہوئے تو اللہ نے ان کی اس نافرمانی و عہد شکنی کی پاداش میں ان پر ایک سخت عذاب بھیجا جس سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں پر جب اللہ کا کوئی فیصلہ کن عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

لعنت بدترین عذاب ہے

'فلما عتوا عن ما نھوا عنہ الایۃ' یہ اس لعنت کا ذکر ہے جو ان نافرمانیوں پر ہوئی اور جس کا ذکر بقرہ ۶۵ اور مائدہ ۶۱ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی سخت تر چیز ہے جو کسی قوم کو فنا کر دیتا ہے اس لئے کہ لعنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم بظاہر زندہ رہتی ہے لیکن اس کی زندگی صرف ذلّت و خواری کی ایک داستانِ عبرت ہوتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اس بستی پر اللہ کی ایسی لعنت ہوئی کہ وہ دیکھنے والوں کے لئے ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ۱۶۷

یہود پر ابدی لعنت

'تاذن' کا صحیح مفہوم کسی فیصلہ قطعی سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے

بنی اسرائیل کی اسی طرح کی بدعہدیوں کی بنا پر ان کو ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اسی طرح کی تنبیہہ ان کو حضرت موسیٰؑ نے بھی بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا الفاظ میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے "اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو ۰۰۰۰ اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا ۰۰۰۰ اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا اور تم اپنے دشمنوں کے سامنے قتل کئے جاؤ گے اور جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے" احبار ۲۶: ۱۴-۱۷۔ اسی طرح کتاب استثنا میں ہے "تیرے بیٹے اور تیری بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا۔ استثنا باب ۲۸: ۳۲۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں جو مرقوم ہے اس کے لئے بخت نصر اور ٹیٹس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے۔ ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان مل جائے گی۔ یہ درست ہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کا کوئی وقفہ مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی۔ قرآن کا اسلوب بیان خود شاہد ہے کہ ان کو وقفے بھی ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لئے کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آج ارض مقدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمع قوت انشاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔ یہاں اشارہ پر قناعت کیجئے۔ اس کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گی۔

"ان ربک لسریع العقاب، وانہ لغفور رحیم" میں اس فیصلہ الٰہی کی حقیقت صفات الٰہی کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے۔ جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لئے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ عذاب کے ساتھ سریع کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لئے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جسے پکڑتا ہے تو آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائی کہ دھر لئے گئے۔

بنی اسرائیل کا انتشار

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ
ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۱۶۸

"وَقَطَّعْنٰهُمْ" اوپر آیت ۱۶۰ میں بھی گذر چکا ہے۔ وہاں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اچھے مفہوم

میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اس کے برعکس ان کی پراگندگی اور انتشار کے دور کے حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی جو تنظیم کی وہ اپنے پورے شباب پر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے دور میں پہنچی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس تنظیم میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا، اور پھر بتدریج حالات ایسے خراب ہوتے گئے کہ یہود اپنے مرکز میں بھی محکوم ہو گئے۔ یہاں تک کہ گروہ گروہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اگرچہ انفرادی حیثیت سے ان میں نیک بھی تھے اور بد بھی۔ لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ ان اوصاف سے محروم ہو گئے تھے جو ایک ملت کی حیثیت سے ان کو دنیا میں سربلند رکھنے کے لئے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔ لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آ گئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوت ارادی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے، وہی کام کئے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے چہیتوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں، خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۱۶۹

عربی میں جب لفظ خلف سکون لام کے ساتھ آتا ہے تو برے جانشینوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ یہود کے تدریجی زوال کی طرف اشارہ ہے کہ دن پر دن ان کے اخلاقی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایسے برے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے جو ایک طرف کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے مدعی ہیں اور دوسری طرف پست ہمتی اور دنائت کا یہ عالم ہے کہ جو لقمۂ حرام بھی ملتا نظر آئے اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ کتاب الٰہی کے نام لیوا ہونے کے سبب سے اگر ضمیر میں کوئی خلش پیدا ہوتی بھی ہے تو ان جھوٹی آرزوؤں سے اس کو بہلا لیتے ہیں جو انہوں نے باطل بے دلیل و سند اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں کہ ہم برگزیدہ امت ہیں۔ ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسے نبیوں کی اولاد ہیں۔ دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے۔ اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں اللہ ہمیں معاف ہی کر دے گا۔ اس طرح انہوں نے اپنے ضمیر اور ایمان کو اس درجہ کند بنا دیا ہے کہ ایک حرام کے بعد اگر اسی طرح کی حرام خوری کا کوئی

دور انحطاط و زوال

اور موقع نکل آئے تو اس پر بھی جھپٹ پڑتے ہیں ان کی اسی دناءت کی وجہ سے آگے چل کر ان کی مثال کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے خواہ اسے چمکاریے یا جھڑکیے۔

الم یوخذ علیھم میثاق الکتاب الآیۃ ' یعنی کتاب کے باب میں تو جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں گزرا اور تورات میں بھی بار بار ذکر ہوا ہے ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو ہدایات اس کتاب میں دی جا رہی ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑیں، بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوں، کوئی بات حق کے خلاف خدا پر نہ لگائیں تو پھر انہوں نے حرام خوری اور حرام کاری کی یہ راہ کس طرح کھول لی اور اس کے حق میں شریعت کی یہ سند کہاں سے فراہم کر دی۔ ودرسوا ما فیہ۔ یعنی انہوں نے اچھی طرح اس کتاب کو پڑھا بھی ہے، یہ نہیں ہے کہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ درس کے لفظ پر ہم انعام آیت ۱۰۵ کے تحت بحث کر آتے ہیں کہ اس کے اصل معنی گھسنے کے ہیں۔ جب کتاب بار بار پڑھی جائے اور وہ بھی انگلی رکھ کے تو ورق گھس جایا کرتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی اچھی طرح پڑھنے کے آنے لگے۔ یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے انہوں نے گھس ڈالا لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد۔ والدار الآخرۃ خیر للذین یتقون ' یعنی بیوقوف دنیا جو کتاب و شریعت کو بالائے طاق رکھ کے اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے انہیں آخرت کی نعمتوں اور کامرانیوں کا کوئی اندازہ نہیں، حالانکہ چاہنے کی اصل چیز وہی ہے لیکن ان بیوقوف لوگوں میں عقل کہاں ؟

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ

الْمُصْلِحِيْنَ : ۱۷۰

تمسیک اور تمسک ' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا یا تھامنا۔ اس کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل کھڑے ہوئے حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ خلق کی اصلاح کرنے والے بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اقامت نماز یہاں تمسک بالکتاب کی علامت کی حیثیت سے بھی مذکور ہے اور یہ چیز درحقیقت ہر عہد الٰہی کی جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں محافظ بھی ہے۔ آیت میں التفات ایجاز کا ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے ' اور جو کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور جنہوں نے نماز کا اہتمام کیا وہی لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ میرے نزدیک

بار بار پڑھا لکھا برباد

مصلحین کا اجر ضائع نہیں ہوگا، تمسک بالکتاب کی علامت اقامت نماز

اس آیت میں اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کی حوصلہ افزائی بھی ہے جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہا اور جو بالآخر مشرف بہ اسلام ہوا۔

وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۱۷۱

اس آیت کی تفسیر بقرہ آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو یہود سے دامن کوہ میں کتاب پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے لیا گیا تھا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا بھی ان کو مشاہدہ کرایا تھا تاکہ وہ یاد رکھیں کہ جس خدا سے وہ عہد کر رہے ہیں وہ بے پناہ قوت و قدرت والا ہے لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر چیز کو جھٹلا دیا۔

۱۶ - آگے کا مضمون - آیات ۱۷۲ - ۲۰۶

آگے کا مضمون خاتمہ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہید میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں مخاطب اصلاً قریش ہیں۔ ان کو پہلے خود ان کے اپنے ملک کی ان قوموں کے حالات سنائے گئے جو ماضی میں گزر چکی تھیں۔ پھر بنی اسرائیل کی بھی پوری تاریخ تفصیل سے سنا دی گئی جو سامنے موجود تھے۔ مقصود ان قوموں کی تاریخ سنانے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اپنی اس دنیا کے احوال و معاملات سے بے تعلق اور کنارہ کش نہیں ہے۔ وہ خلق کی اصلاح و ہدایت کے لئے ہمیشہ اپنے اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور وہ رسول جب بھی آئے ہیں عدل و نصفت کی میزان بن کر آئے ہیں۔ جن قوموں نے ان کی تکذیب کی خدا نے ان کو مٹا دیا اور جن لوگوں نے ان کی تصدیق کی وہ برومند ہوئے۔ یہی فیصلہ کن مرحلہ اب قریش کے سامنے ہے۔

آیت ۱۷۱ پر تاریخی سرگزشتوں کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اب آگے قریش کو مخاطب کر کے پہلے ان کو اس عہد فطرت کی یاد دہانی کی ہے جو تمام بنی آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و ربوبیت کا لیا ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر ان پر حجت قائم کی ہے کہ کل کو خدا کے حضور میں تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس چیز سے بے خبر تھے۔ اس کے لئے خدا نے تم سے عہد بھی لیا ہے اور اب اس کی یاد دہانی کے لئے اپنا رسول بھی تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اہل عرب کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے ان سے بحث کی بنیاد یا تو ان کی جانی پہچانی ہوئی تاریخ پر قائم ہو سکتی تھی یا پھر فطرت اور عقل کی بدیہیات پر چنانچہ پہلے ان کے سامنے تاریخ کے واقعات صحیح زاویے سے پیش کئے پھر عہد فطرت کی اساس پر آگے گفتگو بڑھائی

عہد فطرت کی یاددہانی کے بعد ان کے سامنے بنی اسرائیل کی تمثیل پیش کی ہے کہ تم اس قوم کی طرح خدا کے ناقدرے اور ناشکرے نہ بنو۔ اللہ نے اس قوم پر بڑا احسان کیا لیکن یہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نہایت ہی بے پیر قوم نکلی۔ اللہ نے اس کو ہمیشہ بلند کرنا چاہا لیکن یہ برابر پستی ہی کی طرف جھکی رہی۔ جس طرح کتے کو پیار کرو تو زبان نکالے رہتا ہے، جھڑکو تو زبان نکالے رہتا ہے۔ اسی طرح ان کے لئے تنبیہ اور احسان دونوں یکساں رہے۔

اس کے بعد آنکھ، کان اور دل و دماغ کی نعمتوں کی قدر کرنے اور ان سے صحیح کام لینے کی دعوت دی کہ دین کے معاملے میں لکیر کے فقیر بن کر نہ چلو کہ جن کو باپ دادا پوجتے آئے، بے سمجھے بوجھے تم بھی انہی کو پوجتے رہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں اور اپنے سمع و بصر کی قوتوں سے کام نہ لیں گے اور تذکیر و تنبیہ کے باوجود ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اللہ ان سب کو جہنم میں جھونک دے گا۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ دلائی کہ جو شخص آج تمہیں آنے والے عظیم خطرے سے آگاہ کر رہا ہے یہ کوئی دیوانہ یا خبطی نہیں ہے۔ نظام کائنات پر غور کرو گے تو خود تمہاری عقل گواہی دے گی کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ اس کے پیچھے عظیم حکمت و غایت ہے اس وجہ سے کچھ عجب نہیں کہ تمہارے امر فیصلہ کا وقت قریب آ گیا ہو جس سے یہ پیغمبر تمہیں ہوشیار کر رہا ہے۔ اس امر سے اس حقیقت کے ایک اٹل حقیقت ہونے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ پیغمبر تمہیں اس کا معین وقت نہیں بتا سکتا۔ پیغمبر کوئی غیب دان نہیں ہوتا، وہ صرف ایک بشیر و نذیر ہے۔

اس کے بعد انسان کی اس بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ وہ نعمتیں تو سب خدا سے پاتا ہے لیکن گن دوسروں کے گاتا ہے اور ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بناتا ہے جو نہ تو اس کو کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی ضرر۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کی بیہودہ گوئیوں اور ان کے لا یعنی اعتراضات پر صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور اس صبر کے حصول کے لئے جو چیز واسطہ اور وسیلہ ہے اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے :-

ترجمہ : اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ——— ان کی پیٹھوں سے ——— ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا عذر کرو کہ

ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے، تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا؟ اور ہم اسی طرح اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ رجوع کریں ۱۷۲-۱۷۴

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے۔ اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتی رہی۔ جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بنتا ہے اور جنہیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ ۱۷۵-۱۷۸

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔ اور اللہ کے لئے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں، تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کجروی اختیار کر رہے ہیں، وہ جو کچھ کر رہے ہیں عنقریب اس سے بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا، ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہم ان کو وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں جہاں سے انہیں علم نہیں اور میں انہیں ڈھیل دیئے جا رہا ہوں کیونکہ میری تدبیر بہت ہی محکم ہے۔ ۱۷۹-۱۸۳

کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے، وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی

مدت قریب آ لگی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے ان کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کو وہ ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں۔ وہ تم پر بس بالکل اچانک ہی آ دھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کئے بیٹھے ہو۔ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے، کہہ دو، میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لئے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔ ۱۸۴-۱۸۸

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے تو جب وہ اس کو چھا لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل پھر وہ اس کو لئے کچھ وقت گزارتی ہے تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لئے پکارو، وہ تمہارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو، جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمہیں جواب دیں، اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں۔ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں۔ کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہہ دو تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمہاری ہی مدد کر سکتے ہیں اور نہ

اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لئے پکارو، وہ تمہاری بات نہ سنیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں ، درگزر کرو، نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمہیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتہً ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں اور جو ان خدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے ۔ ۱۸۹ - ۲۰۲

اور جب ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے ! کہہ دو میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ اور جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۔ ۲۰۳ - ۲۰۴

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے، وہ اس کی تسبیح کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۲۰۵ - ۲۰۶

۱۶ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۔ ۱۷۲ - ۱۷۴

"و اذ اخذ ربک" ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اذ' کے ذریعہ سے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی بھی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو، قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کو

فراموش کئے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہوں۔ اسی طرح واحد کے خطاب کے متعلق بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرینہ دلیل ہو تو یہ جمع کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔

"من بنی آدم من ظھورھم" میں "من ظھورھم"، "من بنی آدم" سے بدل واقع ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے بلکہ قیام قیامت تک جتنے بھی بنی آدم پیدا ہونے والے ہیں سب ہی کے متعلق ہے۔

"واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اس کے جواب میں سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ اقرار اللہ تعالیٰ نے صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انہوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لئے تھے حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔

"ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین" "ان" سے پہلے "ذکراھۃ" یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو" اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک توحید اور بدیہیات فطرت کا تعلق ہے ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا، قطع نظر اس سے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔ اگر کسی نبی کی دعوت اس کو پہنچی ہے تو یہ گویا ایک مزید حجت اس پر قائم ہو گئی اور اس کی مسئولیت دو چند ہو گئی۔ لیکن نبی کی دعوت اگر نہیں پہنچی تو یہ بدیہیات فطرت کے مقابلے میں کوئی عذر نہیں بن سکے گی، ان پر مواخذہ کے لئے فطرت کا یہ عہد کافی ہے۔

"او تقولوا انما اشرک اباؤنا الایۃ" اسی طرح لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انہی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انہی کے طریقے کی پیروی کی اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں بلکہ ان کا ہے۔ اس کی سزا ان کو ملنی چاہیئے نہ کہ ہم کو۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف

کے لئے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

'وکذلک نفصل الایات الایہ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ 'لعلھم یرجعون' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیا جائے تو ہمارے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لئے کر رہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت اس طرح قائم کر دیں کہ ان کے لئے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں، کسی اور کی گردن پر اس کا بار الزام ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کی اہمیت یہ بتائی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے ہر شخص مجرد اسی عہد کی بنا پر عند اللہ مسئول ہوگا۔ اس کی اس اہمیت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم غیب کے کسی ایسے ماجرے کی یادداشت انسان کے ذہن میں محفوظ ہے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کس طرح باور کیا جائے کہ فی الواقع انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ توحید کے معاملے میں عند اللہ مسئول ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لئے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا۔ لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناگوں حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا تصور پیدا کیا۔ اس تصور نے اس کے اندر ان ان دیکھی

طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کی، پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ہی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرار توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہم نے نئے فلسفیوں کے اس واہمہ کی تردید سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کی ہے اور اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ ہم نے مذکورہ کتابوں میں واضح کیا ہے کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے نہ حاصل ہونے یا چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت، منعم اور اس کی شکر گزاری کا شعور اور جذبہ، خوف کے جذبہ اور اس کے عوامل پر مقدم ہے۔ اس وجہ سے انسان نے خوف سے دین کا آغاز نہیں کیا بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکر گزاری اور اس کی عبادت سے دین کا آغاز کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف پگڈنڈیوں پر نکل نکل گیا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوح سادہ ہوتی ہے اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں بعد میں ادراک و شعور کے پیدا ہونے کے بعد محض ماحول سے اثر سے ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماحول اپنے اندر نئے آنے والوں پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ خود اس نے کہاں سے لئے ہیں۔ ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو انبوہ بھی ہے وہ سب اس کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے۔ جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے ابھری ہیں وہ خیر، عدل اور معروف ہیں اور جن پر اس کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں، وہ شر اور ظلم بن گئی ہیں۔ خدا کے معاملے میں بھی یہی بے اعتدالی اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک ہی کا اقرار مضمر ہے۔ اتنے پر دنیا کے مشرک اور موحد سب متفق ہیں، اس وجہ سے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے۔ البتہ شرک کے مدعیوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ایک پر جو دوسرے معبودوں کا اضافہ کرتے ہیں ان کی وہ دلیل پیش کریں۔ چنانچہ قرآن نے ان سے جگہ جگہ یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اس کو انہی باتوں کی یاد دہانی کی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ لیکن اس نے اپنی لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ جانے کے سبب سے ان کو نظر انداز

کر رکھا ہے۔ قرآن نے اسی وجہ سے اپنے آپ کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' کہا ہے جن کے معنی یاد دہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم و دعوت کو 'تذکیر' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کردہ یا نظر انداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے لیکن اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مارکس اور فرائڈ کا جادو چلا ہوا ہے۔ ان ظالموں کی خاکبازیوں نے لوگوں کو اس طرح اندھا بنا دیا ہے کہ اب لوگوں کو انسان کے اندر بطن اور فرج کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے نزدیک انسان کا سارا فکر و فلسفہ بس انہی دو محوروں پر گھوم رہا ہے۔ اس روایتی چوہے کی طرح جسے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی تو اس نے پنساری کی ایک دکان کھول لی، مارکس اور فرائڈ نے بھی بطن و فرج پر سارے فکر و فلسفہ اور تمام مذہب و اخلاق کو ڈھال دیا اور اس طرح ان لوگوں کو جو پہلے ہی بطن و فرج کے غلام تھے دو ایسے مرشد بھی مل گئے جن کا وہ فخر کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ بے پیرے نہیں ہیں بلکہ انہیں بھی شرف نسبت و ارادت حاصل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ○ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي ۚ ومن يضلل فاولئك هم الخاسرون ۱۷۵-۱۷۸

'واتل علیھم الآیۃ' 'ھم' سے مراد قریش ہیں جن کو اوپر والی آیات میں مخاطب کر کے عہد فطرت کی یاد دہانی کی گئی ہے۔

'الذی' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لئے آتا ہے لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا کھینچ دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے

بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں ممثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت سنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہاں اس "الذی" سے مراد یہود من حیث القوم ہیں جن کی تمثیل ایک ایسے شخص سے دی گئی ہے جس کو خدا نے اپنی آیتوں سے نوازا لیکن اس نے ان کی قدر نہ کی بلکہ یہ خلعت اس نے اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سنت الٰہی کے مطابق جو سورہ زخرف آیت ۲۶ میں بیان ہوئی ہے کہ (ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین) جو خدائے رحمان کی یاد دہانی سے منہ پھیرتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں ہی سے بن گیا۔ یہ بات کہ یہ کسی معین شخص کا ذکر نہیں بلکہ خدا کی آیات کی تکذیب کرنے والی ایک قوم کی تمثیل ہے، خود قرآن کے الفاظ ہی سے واضح ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فرمایا ہے۔ (ذلک مثل القوم الذین کذبوا بایٰتنا) (یہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی) اس وجہ سے ہمارے نزدیک "الذی" سے کسی بلعام بن باعور کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہود میں کوئی ایک ہی بلعام بن باعور نہیں تھا جس کی مثال دی جائے۔ اوپر یہود کی تفصیل کے ساتھ جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے خود واضح ہے کہ یہ پوری قوم کی قوم ہی شروع سے بلعام بن باعور بنی رہی ہے۔ "انسلاخ" کے معنی کپڑے اتار کر ننگے ہو جانے کے ہیں "انسلخ من ثیابہ" تجرد۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کو اپنی کتاب کی تشریف و خلعت سے نوازا لیکن انہوں نے یہ اتار پھینکی اور بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

ولو شئنا لرفعناہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ " اخلد الی الشیئ " کے معنی کسی شئے کی طرف اس طرح جھک پڑنے اور مائل ہونے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اسی کا ہو کے رہ جائے۔ یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے، اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعہ سے ان کو دین و دنیا دونوں کی سرفرازی عطا فرماتا ہے۔ ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کتے کی طرح زمین کو سونگھتے ہوئے ہی چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث " (اس کی مثال کتے کی سی ہے

پستی کی طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور دیکھئے کیسی دل نشین اور مطابق واقعہ تمثیل ہے۔ اوپر آیات ۱۶۸ - ۱۶۹ میں ان کا حال یہ بیان ہوا تھا کہ خدا نے اپنے انعامات اور اپنی تنبیہات دونوں سے ان کو آزمایا (وبلونا ھم بالحسنات والسیات) لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ایسے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے۔ بلکہ ہر طمع نے ان کو ٹھوکر کھلائی اور ہر خواہش کے آگے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے (یاخذون عرض ھذا الادنی ویقولون سیغفر لنا وان یاتھم عرض مثلہ یاخذوہ) ان کی اس حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بخط مستقیم گردن اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں بلکہ ناک ہوتی ہے جو اس کی خواہشوں کی سراغ رساں ہے۔ پھر اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے ہوتے رہتا ہے۔ چمکاریے، پیار کیجئے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی، دھتکاریے جھڑکیے، جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا۔ یہ اس کی حرص اور دناءت ہے، جو اس کی جبلت پر اس طرح غالب ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ بھوکا رہے گا جب بھی آپ اس کو اسی حال میں پائیں گے۔ پیٹ بھر کے کھلا دیجئے جب بھی اسی ہیئت میں دیکھیں گے۔ صاحبوں کے کتے مخملیں جھول، ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھنگروؤں سے آراستہ ہوتے ہیں، پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے ہوتے رہیں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی زمین میں تلاش کرتے، سونگھتے اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ فرمایا کہ بالکل یہی حال یہود کا ہے ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں رہا ہے۔ ان کی قوت ارادی بالکل معطل ہو چکی ہے اب یہ اپنی خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص و دناءت ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آیت میں 'تحمل علیہ' میرے نزدیک 'تحمل العصا علیہ' یا 'تحمل الحجر علیہ' کے معنی میں ہے یعنی لکڑی اٹھاؤ یا پتھر پھینکو اس کا حال ایک ہی رہے گا۔ 'لہث' کے معنی زبان نکالنے کے ہیں اور اس کا غالب استعمال کتے کے لئے ہے۔

'ذلک مثل القوم الذین کذبوا الایۃ' اس ٹکڑے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تمثیل کسی شخص کی تمثیل نہیں بلکہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس سے مراد جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہود ہیں۔ سورہ نحل آیات ۹۱ - ۹۲ کے تحت

انشاء اللہ ہم تمثیل کے اس پہلو پر مزید بحث کریں گے۔

یہود کی یہ تمثیل، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، قریش کو سنائی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو اس نعمت کی قدر کرنے کے لئے ابھارنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی شکل میں ان کو مل رہی تھی لیکن وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس سے بدک رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کو آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ ان آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان دونوں کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنی خواہشات ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا ہے۔

'ساء مثلاً القوم'، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والی قوم اپنی خواہشات کی غلامی کے سبب سے بالکل یہیز بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال، جیسی کہ اوپر بیان ہوئی، نہایت ہی مکروہ اور گھنونی ہے۔ سو یہ راہ تم نہ اختیار کرو۔ جو لوگ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی آیات کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ ان آیات کی ناقدری کرکے خود اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کے بجائے اپنے لئے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔

'من یھد اللہ'، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی بھی ہے اور قریش کے لئے تہدید و وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے۔ اور خدا کی توفیق انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتے ہیں خدا انہیں گمراہی کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اصل نامراد اور بدقسمت لوگ وہی ہیں۔

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ اعراف

(۷)

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ۭ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ۝ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۔ ۱۳۸-۱۴۰

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ الایہ، اس اسلوب میں جو بلاغت ہے اور بنی اسرائیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام و عنایت کی جو شان ہے اس کی طرف ہم بقرہ آیت ۵۰ کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں ظاہر ہوئی ہیں اور اس نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی جس طرح مدد فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو جس طرح ہلاک کیا وہ سب سامنے آ گیا اور اس پہلو سے یہ سرگزشت ان سرگزشتوں کا تکملہ و تتمہ بن گئی جو اس سورہ میں پیچھے گذر چکی ہیں، اب آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کا

وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ اس حصہ سے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پہ بنی اسرائیل کی مدد کی اور ان کی رہنمائی فرمائی لیکن بنی اسرائیل نے ہر قدم پہ ناشکری کی اور ٹھوکر کھائی۔

'فاتوا علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لھم' یہاں لفظ 'قوم' سے ان قوموں میں سے کوئی قوم مراد ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا سے نکلنے کے بعد سابقہ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر قوم بت پرست تھی۔ 'یعکفون علیٰ اصنام' کا اسلوب بیان فی الجملہ ان کی تحقیر کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ایسے ناسمجھ اور احمق تھے کہ خدائے رحمان و رحیم کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں سے چمٹے ہوئے اور ان کی بندگی اور پوجا میں سرگرم تھے۔ لفظ 'عکوف' جب 'علیٰ' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کسی شے پر جم جانے اور اس سے اپنے آپ کو وابستہ کر لینے کے آتے ہیں۔

'قالوا یا موسیٰ اجعل لنا الٰھًا' لیکن ان سے زیادہ احمق بنی اسرائیل نکلے کہ یہ تماشا دیکھتے ہی اس پہ ریجھ گئے اور حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ جیسے دیوتا ان کے پاس ہیں ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لئے بھی بنا دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اتنی پست کر دی تھی کہ خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی ظلمات ہی میں تھے۔ قدیم مالوفات سے وابستگی آسانی سے نہیں جاتی۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد تمام آثار شرک یک قلم مٹا دینے کے احکام جاری فرما دیئے کہ خام اور کمزور لوگوں کے لئے یہ چیزیں فتنہ نہ بن سکیں۔

'قال انکم قوم تجھلون' حضرت موسیٰؑ نے مطالبہ کے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو۔ 'ان ھؤلاء متبر ما ھم فیہ' یہ تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب خدا کے ہاں بالکل برباد و پامال کر دیا جائے گا اس لئے کہ یہ یکسر باطل ہے۔ سوچو کہ اپنی ہدایت و شریعت کے لئے تمہارا انتخاب کرکے تمہیں ساری دنیا پر فضیلت و سرفرازی تو اللہ نے بخشی تو کیا اب میں اس کو چھوڑ کر تمہارے لئے کوئی اور معبود ڈھونڈنے نکلوں۔ اس سے بڑی ناشکری و ناسپاسی اور کیا ہوگی!

وَ اِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ۔ ۱۴۱

اس آیت کی تفسیر بقرہ میں بھی گذر چکی ہے اور اس سورہ میں بھی۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے لے کر آگے آیت ۱۴۷ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو اپنی ہدایت و شریعت سے مشرف فرمانے کے لئے کیا لیکن اس سارے انعام کی بنی اسرائیل نے یہ قدر کی کہ اُدھر حضرت موسیٰؑ طور پر اللہ کی شریعت لینے گئے ادھر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی تمام نصیحتوں اور ان کے خلیفہ حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم وہی بیت ڈھال کر تیار کر دیا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو وہ تنبیہہ و ملامت فرمائی تھی جس کا ذکر اوپر گذرا۔ مقصود اس ساری تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ جو قوم آج اپنے شرف و تقدس پر اتنی نازاں ہے، عین اپنے نبی کی موجودگی میں اور اس کے عظیم معجزات کو دیکھتے ہوئے کیا حرکتیں کر چکی ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۱۴۲

اس آیت کی وضاحت بقرہ ۵۱ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہ اس انعام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی شریعت دینے کے لئے فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ وہ ۳۰ دن کے لئے کوہ طور کے ایک مخصوص مقام پر حاضر ہوں۔ حضرت موسیٰؑ جیسا کہ طٰہٰ آیت ۸۴ کے تحت بحث آئے گی وقت مقررہ سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ہر چند حضرت موسیٰؑ کی یہ سبقت رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس عجلت و سبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ۳۰ دن کی مقررہ مدت بڑھا کر ۴۰ دن کر دی جائے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر یہ واضح کریں گے کہ انبیا علیہم السلام اتباع ہوا سے مغلوب ہو کر کبھی غلطی نہیں کرتے۔ لیکن اتباع رضائے الٰہی کے جوش میں اگر کبھی کوئی قدم ان کا حدود سے ذرا بھی تجاوز اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ان کو روک دیتا ہے اس لئے کہ وہ حق کی میزان ہوتے ہیں اور میزان کا ہر پہلو سے ٹھیک ہونا اور سو فی صدی ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

'وقال موسیٰ لاخیہ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اپنی وقتی غیبت کے دوران بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے فرمایا۔ انہوں نے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لئے

حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی، کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت و ضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرتے رہنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ ولا تتبع سبیل المفسدین' کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قوم کے اندر بد عناصر فساد تھے حضرت موسیٰؑ ان سے آگاہ تھے۔ اور ان کی طرف سے ان کی پچھلی کارستانیوں کے سبب سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس وجہ سے انہوں نے حضرت ہارونؑ کو خاص تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا ——— یہ ملحوظ رہے کہ یہ سارا اہتمام اس لئے بیان ہو رہا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ بنی اسرائیل نے اسی دوران میں گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی تو اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۱۴۳

'میقات' کے معنی وقت مقرر کے ہیں۔ یہاں 'میقات' سے مراد وہ وقت خاص ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے خطاب و کلام سے مشرف کرنے کے لئے مقرر فرمایا۔

'قال رب ارنی انظر الیک' کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو شوق ہوا کہ جس کا کلام سامعہ نواز ہوا ہے اس کا دیدار بھی باصرہ نواز ہو۔ چنانچہ انہوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کی کہ اے رب تو مجھے اپنے آپ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اس پر ملامت نہیں فرمائی، بلکہ یہ فرمایا کہ انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف اس کی صفات کے مظاہر ہی کو دیکھ سکتا ہے۔

انسان ناسوتی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا

'ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی' یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لئے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ وجبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت محدود ہے اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک حد سے

متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے۔ بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بیکار ہو جاتے ہیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لئے حیات بخش ہے جب تک وہ طویل فاصلے سے نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ زمین سے قریب آ کر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جاندار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں تو جب اس کائنات کی مخلوق اشیا کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماورا اور بالاتر ہے اور فرمایا کہ تم میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم سمجھنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو اگر نہ ٹکا رہ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز تمہاری برداشت سے بدرجۂ اولیٰ بالاتر ہے۔

'فلما تجلیٰ ربہ للجبل جعلہ دکا' دک الحائط، ھدمہ حتی سواہ بالارض' 'دک الارض' سوی صعودھا و ھبوطھا 'دک الحائط' 'دک الارض' کے معنی ہوں گے دیوار کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا، یا زمین کے تمام نشیب و فراز برابر کر دیئے۔

'جبل' سے مراد یہاں پورا پہاڑ اور پورا سلسلۂ کوہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خاص حصہ یا حضرت موسیٰؑ کے سامنے کی کوئی مخصوص چوٹی ہے۔ کل بول کر جزو مراد لیا ہے جیسا کہ ہر زبان میں معروف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب پہاڑ کے مخصوص حصے پر اپنی تجلی ڈالی تو پہاڑ پاش پاش ہو کر منہدم ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تجلی ذات کا محض ایک پرتو اور ایک شمہ ہی رہا ہو گا۔ لیکن پہاڑ جیسی جامد چیز بھی اس کی تاب نہ لا سکی اور حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

فلما افاق قال سبحٰنک تبت الیک و انا اول المومنین، جب حضرت موسیٰؑ ہوش میں آئے تو بولے کہ 'سبحٰنک' تو اس سے ارفع و منزہ ہے کہ تجھے ان ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جا سکے 'تبت الیک' میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی، میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں 'وانا اول المومنین' اور میں سب سے پہلا اس بات پر ایمان لانے والا بنتا ہوں کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت موسیٰؑ کو یہ سب کچھ بنی اسرائیل کی ایک شدید عقلی بیماری کو

بنی اسرائیل کی محسوس پرستی کا علاج

دور کرنے کے لئے دکھایا۔ تورات میں متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار حضرت موسیٰؑ سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ خدا جب تم سے بات کرتا ہے تو ہم سے بھی رو در رو ہو کر بات کرے اور ہم اس کو دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ تمام نشانیاں جو انہوں نے اب تک دیکھی تھیں وہ ان کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہوئیں۔ ایک اَن دیکھے خدا پر کسی طرح ان کا دل جمتا ہی نہیں تھا، اوپر اجعل لنا الٰھًا کما لھم اٰلھۃ، کا جو مطالبہ ان کی طرف سے مذکور ہے وہ بھی ان کی اسی خواہش کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو ایک پیکرِ محسوس میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محسوس پرستی کی بیماری کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو واضح طور پر بتا اور دکھا دیا کہ خدا آنکھوں سے دیکھنے اور ہاتھوں سے چھونے کی چیز نہیں ہے، صرف عقل سے سمجھنے اور دل سے ماننے کی چیز ہے آنکھیں صرف اس کی صفات کے جلوے دیکھ سکتی ہیں اس سے آگے ان کی رسائی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ ساری باتیں بنی اسرائیل کو سمجھائیں لیکن یہ کھٹک ان کے دلوں سے گئی نہیں چنانچہ اس کی وجہ سے وہ خدا کے عذاب میں بھی آئے جس کا ذکر بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

اس مقام سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جن جوگیوں اور صوفیوں نے مشاہدۂ ذاتِ الٰہی کو معرفت کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس کو اپنا نصب العین بنایا ہے انہوں نے اپنا گول اپنی رسائی کے حدود سے بہت آگے بڑھ کر باندھا ہے اور اس کا حاصل خیرگی اور تحیّر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مکس شہباز کے شکار کے لئے نکلے۔ ہم سورۂ نجم کی تفسیر میں انشاء اللہ بتائیں گے کہ اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحبِ قرب حضرت جبرئیل ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغِ تجلّی بسوزد پرم

قَالَ يٰمُوْسٰىٓ اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۱۴۴

جو بخشا گیا اس پر قناعت کرو

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے تمہارے شرف کے لئے یہی بس ہے، میں نے جو تعلیم و ہدایت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور برابر میرے شکر گزار رہو۔ یعنی اس کا حق ادا کرو، خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو، دوسروں کو بھی یہ بتاؤ اور سکھاؤ۔ اندازِ کلام سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقہ سے نکلتی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمہارے لئے یہی بہت ہے، اس پر قناعت کرو۔ میرے دیدار کی خواہش نہ کرو۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۱۴۵

'وکتبنا لہ فی الالواح' تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا؟ توراۃ سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔

"اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جاکر خدا کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیئے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔" خروج ب ۲۴ ۳-۴۔

دوسرے مقام میں اس طرح ہے :-

"اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لئے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔" خروج ب ۳۲ ۱۵-۱۶

الواح سے متعلق توراۃ کی دو مختلف روایتیں

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو محتمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی نے لکھا۔ ایک پل کی تعمیر انجینیر کرتا ہے، لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبہ اور نقشہ کے تحت کرتا ہے اس لئے کہا یہ جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا۔ قرآن کی حفاظت کا تمام اہتمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضؓ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ 'وانا لہ لحافظون' اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ الفاظ اس اہتمام و عنایت کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو انبیا علیہم السلام آئے انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل سے ہی ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لئے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ..... ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی جو قدر انہوں نے کی اس کی تفصیلات بقرہ میں بھی گذر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

بنی اسرائیل کے لئے تعلیم بالقلم کا اہتمام

من کل شیءٍ موعظۃ و تفصیلاً لکل شیءٍ ' یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی۔ من کل شیءٍ اور لکل شیءٍ ' اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس کا تعلق پیش نظر مقصد و موضوع ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلہ میں دین و شریعت کی جو باتیں بتانی مدّ نظر تھیں وہ ساری باتیں بھی بتائی گئیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی درج الواح ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ الواح میں صرف مشہور احکام عشرہ ہی درج ہوئے۔ لیکن یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر ہم نے کتاب خروج سے جو حوالے نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں دو تھیں اور دونوں اپنی دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تورات کے مذکورہ مقام پر بہت سی دوسری تفصیلات بھی ہیں جو جماعتی تنظیم و تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس مرحلہ میں بنی اسرائیل کو ان سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے تورات کی طرح صرف دو ہی تختیوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ' الواح ' کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع کے لئے آتا ہے اور عربی میں جمع کا اطلاق دو سے زیادہ پر ہوتا ہے۔

الواح میں مندرج تفصیلات کی نوعیت

' فخذھا بقوۃ وامر قومک یاخذوا باحسنھا ' اس کو مضبوطی سے پکڑو یعنی پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں خواہ نرم ہوں یا سخت اس کی ہدایات پر جمے رہو اور اپنی قوم کو بھی ہدایت کرو کہ دوسری جاہل قوموں کی ریس میں ان کے جیسے بتوں کی فرمائش نہ کرے اور نہ ان کے طور طریقے اختیار کرے بلکہ اس بہتر طریقے کو اپنائے، جو اس نوشتہ میں بتایا گیا ہے۔ ' باحسنھا ' میں جو تقابل و تفاضل ہے وہ نوشتہ الواح کی مختلف ہدایات میں نہیں ہے اس لئے کہ وہ تو ساری کی ساری احسن بھی تھیں اور سب بلا استثناء انتخاب اختیار کرنے کے لئے بھی تھیں بلکہ یہ ترجیح مشرک قوموں کے اس طور طریقے کے مقابل میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے بعد سابقہ پیش آیا اور جن سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے وہ مطالبہ پیش کر دیا جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳۸ میں گذرا۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ جائیں بلکہ اس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقہ کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔ تفضیل کا صیغہ اس مفہوم کے لئے قرآن میں بعض دوسرے مواقع میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ زمر آیت ۵۵ میں۔ انشاء اللہ کسی موزوں مقام میں ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

صیغہ تفضیل کا ایک خاص محل

آگے کے مراحل کے لئے بدرقہ:

(سارِیکم دارالفاسقین) یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان ہدایات و تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑنا تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمہیں کفار و شرک کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آنا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمہارے لئے بدرقہ اور زاد راہ کا کام دیں گی اور انہی کے ذریعہ سے تم غالب اور فتح مند رہو گے ان سے مسلح رہے بغیر تمہاری قوم کے لئے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

(سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط
وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا ج وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ
الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ج وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ
سَبِیْلًا ط ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ
وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَۃِ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ
ھَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۱۴۶-۱۴۷)

ایک برمحل تنبیہ:

یہ برموقع ایک جامع تنبیہ و تذکیر ہے کہ کون لوگ ان تعلیمات کی قدر کریں گے، ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون ان سے منہ موڑیں گے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی محرومی سے دوچار ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی زمین میں رہتے بستے اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز، اس کے امر و حکم سے اپنے آپ کو بالاتر اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا استحقاق ذاتی سمجھیں گے اللہ ان کو ان ہدایات کی طرف مائل ہونے کی توفیق نہیں دے گا۔ ایسے لوگوں کے اندر خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی راہ کی دعوت دی جائے تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں، ان کی یہ حالت نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا زندگی گذارتے ہیں اور واضح سے واضح بات بھی ان کے سامنے آئے تو اس کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کی آیات اور آخرت کی ملاقات کے جھٹلانے والے ہیں ان کے سارے اعمال اکارت اور بے ثمر ہو کے رہ جائیں گے۔ آخرت میں صرف اسی عمل کی قدر و قیمت ہے جو خدا کی رضا کے لئے آخرت کو سامنے رکھ کر کیا جاتے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِہٖ مِنْ حُلِیِّھِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّہٗ
خُوَارٌ ط اَلَمْ یَرَوْا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُھُمْ وَلَا یَھْدِیْھِمْ سَبِیْلًا م
اِتَّخَذُوْہُ وَکَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۱۴۸

کر حیران رہ گیا کہ مندر میں بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویہ سے نصب کئے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں۔ اب غور کیجئے کہ جو بادشاہ سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا ہو عوام کالانعام کے دلوں میں اس کی خدائی کا سکہ جمانے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی!

الغرض سامری کے لئے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس طرح کا کوئی بچھڑا بنا لینا تو کوئی مشکل کام نہ تھا جس سے بچھڑے کی سی آواز نکلے۔ لیکن اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عوام فریبی کے لئے اس نے اپنے مکاشفہ اور ایک خاص کرامت کا بھی ڈھونگ رچایا جس سے اس کا رنگ عوام پر خوب جم گیا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجئے، سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معبود کی ضرورت

'الم یروا انه لا یکلمهم ولا یهدیهم سبیلا'، یہ بات کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے یہ ذرا نہ سوچا کہ جو نہ بات کر سکتا نہ رہنمائی کر سکتا تو آخر وہ کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے۔ معبود کوئی کھلونا نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت وابستہ ہے کہ وہ رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے ایک چیز کا وجود بے معنی ہے تو اس کو معبود کیوں مانیے اور اس کی عبادت کیوں کیجئے۔

'اتخذوہ وکانوا ظلمین'، یہ اصل بات کا حصہ ہے یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ
لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۱۴۹

بعد از وقت ندامت

سقط فی ایدیھم، عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور پر نادم اور خجل ہونے کے کئے گئے ہیں۔ لیکن ندامت و خجالت کا لازم چونکہ غلطی پر متنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ متنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر محاورے کی اصل کی تحقیق ہے بڑا مشکل کام۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی شے کا ہاتھ میں گرا دیا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہاتھ کنگن کے لئے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح مان لی جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سامری اور اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہی اسرائیل کا خدا

برآمد ہوا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم تو نامراد ہوئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان لوگوں کو ہوا جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ موجود تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں اگرچہ وہ صحیح صورت حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ معاملہ تو بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں، کوئی ایک شیطان اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھ دار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گذر جاتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي
مِنْ بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ
أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا
يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۔ ۱۵۰-۱۵۱

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑی پر اس حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ قرآن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھی چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو نہایت غصہ اور غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں، غصہ ان کو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر تھا اور غم و افسوس اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر۔ آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستہ پر ڈالا یا جانے دیا۔

واعجلتم امر ربکم، یعنی قبل اس کے کہ خدا یہ بتائے کہ اس کی عبادت کا طریقہ کیا ہے (اور یہی بتانے کے لئے اس نے مجھے پہاڑ پر بلایا) تم نے سبقت کر کے خود عبادت کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا۔ حالانکہ یہ چیز تمہارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی تھی۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لئے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ بت پرستی دراصل عقیدہ حلول کے تحت وجود میں آئی ہے۔ مشرکین سمجھتے ہیں کہ خدا ان

صورتوں اور مورتوں میں حلول کر جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث آئے گی۔

'والقی الالواح و اخذ' یہ ان کے غلبۂ حال اور جوشِ حمیت کی تصویر ہے کہ تختیاں تو انہوں نے ایک طرف ڈال دیں اور حضرت ہارونؑ کا سر اور شانہ پکڑ کر ان کو جھنجھوڑنے لگے۔ مطلب یہ کہ یہ کیا ہوا؟ تم نے اس فتنہ کو کیوں سر اٹھانے دیا؟ چونکہ اصل ذمہ داری حضرت ہارونؑ ہی پر تھی، اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے وہ سب سے زیادہ عتاب کی زد میں آئے۔ اللہ کے معاملے میں یہ جوش و جذبہ غیرتِ ایمانی کا بھی تقاضا ہے اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ قلبی محبت کا بھی۔

'قال ابن ام ان القوم استضعفونی' یہ حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور اندازِ خطاب بہت پیارا ہے۔ یا اخی نہیں کہا بلکہ 'ابن ام' اے میرے ماں جائے کہا جس سے شفقت اور استمالت دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ "قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں" اس سے واضح ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ سے لوگوں کو روکا بلکہ اس کے لئے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی۔ لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آ گئی اور خود ان کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے ان کے لئے اس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انہوں نے، جیسا کہ دوسری جگہ بیان آئے گا، مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا ان کا کوئی اقدام کسی مزید فتنہ کا باعث ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے 'انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل و لم ترقب قولی۔ طٰہٰ' (میں ڈرا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا)۔

'فلا تشمت بی الاعداء الایۃ' یعنی دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کر۔ یہ سارا فتنہ شریروں کا اٹھایا ہوا ہے، میں اس سے بالکل بری ہوں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ سارا عتاب مجھ پر ہوا تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوں گے کہ فتنہ تو انہوں نے اٹھایا اور ذمہ داری ساری مجھ پر آ گئی۔

حضرت ہارونؑ کی طرف سے صفائی

اس سے مرتبینِ تورات کے اس جھوٹ کی پوری پوری تردید ہو گئی جو انہوں نے حضرت ہارونؑ پر لگایا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام حضرت ہارونؑ کے اہتمام میں انجام پایا۔ قرآن نے نہ صرف حضرت ہارونؑ کو اس ذلیل تہمت سے بری کیا بلکہ اس فتنہ کے اصل بانی کی بھی نشان دہی کی اور اس کے

(یعنی تورات کے بیان کی تردید)

اس سارے ڈھونگ کو بھی بے نقاب کیا جو عوام فریبی کے لئے اس نے رچایا۔ اپنے موقع پہ اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

(قال رب اغفرلی الآیہ) حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ حضرت ہارونؑ پر یہ شبہ تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانیوں میں ہوں گے البتہ یہ شبہ حضرت موسیٰؑ کو ہوا ہوگا کہ انہوں نے اس کے روکنے کے لئے اپنی ذمہ داری کما حقہ ادا نہیں کی۔ حضرت ہارونؑ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہ سکتے تھے تو ان کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس سے الگ رکھیں اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کریں۔ صورت معاملہ واضح ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لئے مغفرت مانگی اس لئے کہ دعائے مغفرت میں صحیح ادب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ حمیّت حق کے جوش میں بھائی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ
وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۝ وَالَّذِينَ
عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن
بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۱۵۲-۱۵۳

گوسالہ پرستوں پر غضب الٰہی

یہ وہ وعید ہے جو اس موقع پر بنی اسرائیل کو سنائی گئی۔ جن لوگوں نے یہ گوسالہ سازی کی ہے ان پر آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی میں بھی خدا کا غضب اور ذلت کی مار ہوگی اس لئے کہ یہ اللہ پر افترا کیا گیا ہے اور اللہ پر افترا کی سزا یہی ہے البتہ جو لوگ توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیں گے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب جس شکل میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل سورہ بقرہ آیت ۵۴ کے تحت ہم پیش کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ہر قبیلہ کے مومنین مخلصین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے ان مجرمین کو قتل کر دیں جو اس فتنہ میں شریک رہے ہیں، چنانچہ یہی ہوا۔ صرف وہ لوگ قتل سے بچے جنہوں نے توبہ کر لی۔ شرک کو اللہ پر افترا قرار دینے کی وجہ دوسری جگہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں توبہ کے ساتھ ایمان کی شرط مذکور ہے (ثم تابوا من بعدھا و اٰمنوا) اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کا ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ انہی گناہوں میں سے تھا اس وجہ سے توبہ کے ساتھ تجدید ایمان کی شرط لگائی گئی۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہو تو توبہ

کے ساتھ رویے کی اصلاح توبہ کو مکمل کر دیتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى
وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ (۱۵۴)

'سکت' کے بعد 'عن' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'زال' یا اس کے کسی ہم معنی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰؑ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا۔

تورات کی ایک غلط روایت کی تردید

'اخذ الالواح' انہوں نے وہ تختیاں جو ایک طرف ڈال دی تھیں پھر اٹھا لیں۔ اس سے ضمناً تورات کی اس غلط روایت کی تردید ہو گئی کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔۔ واضح رہے کہ ان تختیوں کو اس طرح ڈال دینے میں ان کی ناقدری کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل نے اس نعمت گراں مایہ کی جو ناقدری کی تھی اس پر اظہارِ غم و غصہ تھا کہ تمہارے رب نے تو تمہارے لئے یہ توقیع سیادت و امامت بھیجا اور تم ہو کہ تم نے اس طرح اپنی ناک کٹوا لی۔

'وفی نسختها هدی و رحمة' نسخہ کسی تحریر یا کتاب کو کہتے ہیں۔ اصل تورات چونکہ انہی الواح کی نقل تھی اس وجہ سے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈریں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ہے جو قرآن سے متعلق 'هدی للمتقین' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ہدایت و رحمت سے متعلق ہم دوسرے مقام میں عرض کر چکے ہیں کہ جب یہ دونوں لفظ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ دنیا کی زندگی میں یہ رہنما ہو گی اور آخرت میں خدا کی رحمت کا وسیلہ۔

وَاخْتَارَ مُوسَى قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ
أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ
بِهَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
وَارْحَمْنَا ۖ وَأَنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ○ وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ
مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (۱۵۵-۱۵۶)

یہ حضرت موسیٰؑ کے اس بارہ گروہ حبشیا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ کوہِ طور پر گئے، واقعہ کے بعد توبہ کیلئے

لئے گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے اس وجہ سے بات گھپلا ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کیا ہے اس لئے کہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر کیا اور حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم ثابت ہوا ہے اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں۔

"فلما اخذتھم الرجفۃ" اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلال ظاہر فرمایا تاکہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کو پھر یاد دہانی ہو جائے کہ جس خداوند خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اس کے جلال و جبروت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے:۔

"جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے .... اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا ..... اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔ خروج باب ۱۹ - ۱۸ - ۱۹

اگرچہ تورات میں یہ ذکر اس موقع کا ہے جب بنی اسرائیل کو مشہور احکام عشرہ دیئے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورت حال اس موقع پر بھی پیش آئی جس کا ذکر قرآن نے "اخذتھم الرجفۃ" سے کیا ہے۔

"قال رب لو شئت اھلکتھم" الخ یہ حضرت موسیٰؑ کی گریہ وزاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمارے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام تو اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا۔ لیکن اب جبکہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کرے۔

"اتھلکنا بما فعل السفھاء منا" مطلب یہ کہ یہ جو کچھ ہوا ہمارے اندر کے نادانوں کی بدبختی سے ہوا اور یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو نادانوں کے کسی جرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دے۔

"ان ھی الا فتنتک" [illegible] تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برآ تو وہی ہو سکتے ہیں جن کو توفیق حاصل ہو، تو ہی جن کو توفیق بخشتا ہے تیرے امتحان میں

کامیاب ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں اور جن کو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ نے اسی سنۃ اللہ کا حوالہ دیا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کا ذکر قرآن میں بار بار ہو چکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی نہایت ادب کے ساتھ اور نہایت ہی لطیف طریقہ پر اس میں معاملے کی نزاکت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تیرے امتحانوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ تیرے فضل اور تیری توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے تو ہمیں بخش، ہم پر رحم فرما، تو بہترین بخشنے والا ہے۔

'واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنۃ الایہ' اس دنیا میں بھی تو ہمارے لئے بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے۔ آخرت کے ساتھ لفظ 'حسنۃ' کو حذف کر دیا اس لئے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل ہے۔ لفظ 'ھدنا' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہود کے لئے ایک لطیف یاد دہانی بھی ہے کہ اگر ان میں کچھ حیا ہے تو اپنے نام کی لاج رکھیں

'قال عذابی اصیب بہ من اشاء الایہ' حضرت موسیٰؑ کی دعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لئے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنے عذاب و رحمت کا اصل ضابطہ بیان فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ "جن پر چاہتا ہوں" کا مطلب بار بار ہم واضح کر چکے ہیں کہ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں اپنا عذاب ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانون عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوان کرم سے پہنچ رہا ہے۔ امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس بھی جو کچھ ہے میرا ہی عطا کردہ ہے۔ لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لئے خاص رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان کے لئے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

عذاب اور رحمت کا ضابطہ

'والذین ھم بآیاتنا یومنون' کا ٹکڑا یہاں خاص طور پر توجہ طلب ہے یوں نہیں فرمایا کہ یتقون ویوتون الزکوٰۃ ویومنون بآیاتنا، بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا 'والذین ھم بآیاتنا یومنون' اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ 'خاص کر وہ

لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے جو اس قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے لئے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ و اتیتم الزکوٰۃ و امنتم برسلی و عزرتموھم و اقرضتم اللہ قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیاتکم ولادخلنکم جنٰت تجری من تحتھا الانھار فمن کفر بعد ذلک منکم فقد ضل سواء السبیل۔

۱۲ مائدہ

اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمہارے گناہ تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰؑ نے، جیسا کہ بقرہ میں گذر چکا ہے بڑی تصریح کے ساتھ فرما دی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب و حکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ۔ قال ءاقررتم و اخذتم علیٰ ذلکم اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا و انا معکم من الشٰھدین ۸۱

آل عمران

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا، پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کی جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس باب میں میری بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اس پر گواہ رہو میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف " والذین ھم بآیاتنا یؤمنون " کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرما دی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تصدیق و تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار و خدمت گزار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو قرآن نے بسبیل تضمین و تفسیر وضاحت فرما دی کہ آج اس " والذین ھم بآیاتنا یؤمنون " کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا :-

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ١٥٧

امّی کی وضاحت

یعنی وہ لوگ جو اس نبی امّی کی پیروی کریں جس کی پیشین گوئیاں خود ان کی اپنی کتابوں تورات و انجیل میں موجود ہیں۔ " نبی اُمّی " سے مراد ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول، نبی، امّی یہ تینوں الفاظ یہاں آپ کی تعریف اور تعارف کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ نبی اور رسول کے فرق کی طرف مختلف مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اپنی قوم کے لئے کامل حجت اور کامل عدالت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے قوم پر اللہ کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو لازماً مخالفین پر غلبہ حاصل ہوتا ہے عام اس سے کہ یہ نبی کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی وفات کے بعد۔ نبی کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پہلو سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔

ذریت اسمٰعیل کے لئے ابراہیمؑ کا [illegible]

لفظ اُمّی پر ہم آل عمران کی آیت ۲۰ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیلؑ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنی اسمٰعیلؑ چونکہ تعلیم و تعلّم اور کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ تھے، اس پورے دور میں جو ان کے بزرگ خاندان حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد گزرا ان کے ہاں کسی نبی

یا رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی جب کہ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے اندر بے شمار نبی پیدا ہوئے جن میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل بنی اسمٰعیلؑ کو "امیین" کہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل اس لفظ کو بنی اسمٰعیل کے صرف ایک وصف امتیازی ہی کو پیش نظر رکھ کر نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے مقابل میں ان کی کمتری کا پہلو بھی ان کے ذہن میں ہوتا تھا لیکن امیت و بدویت اور کتاب و شریعت سے بیگانگی چونکہ بطور ایک امر واقعہ کے ان کے اندر موجود تھی اس وجہ سے قرآن میں، جیسا کہ سورہ جمعہ میں ہم واضح کریں گے، اس لفظ کو ان کے لئے بطور ایک ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہ رضؓ بھی اس کو بلا کسی احساس کمتری کے استعمال کرتے تھے۔ گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لئے یہ ایک امتیازی لقب تھا۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات و انجیل کی جن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے ان میں سے بعض کا، جو موجودہ تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں، ذکر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔ محض بطور یاد دہانی ان کا حوالہ یہاں ہم پھر دیئے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب بنی اسمٰعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت سے پہلے سے واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا ... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" استثناء ۱۸: ۱۵-۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰؑ نے بھی یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیلؑ یعنی امیین میں پیدا ہوگا اس لئے کہ اس سیاق میں "تیرے بھائیوں میں سے" یا "انہی کے بھائیوں میں سے" کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیلؑ میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔ تفصیلات اس کی بقرہ میں گذر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لئے کہ "میری مانند" اور

"تیری مانند" سے مراد حضرت موسیٰؑ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔ جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔" استثنا ۳۳ : ۲

"آتشی شریعت" سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا۔ دانے کو بھس سے الگ کرے گا۔ پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لئے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعہ سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی ان الفاظ میں مذکور ہے :-

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا، اس کا زوال نہ ہوگا نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔" یسعیاہ ۴۲ : ۱-۴

سیدنا مسیحؑ کی پیشین گوئی ملاحظہ ہو :-

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لاتے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی ۲۱ : ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔" یوحنا ۱۴ : ۱۶

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں

اس کا کچھ نہیں۔“ یوحنا ۱۶: ۱۳

ان پیشین گوئیوں پر غور کیجئے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشین گوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے۔ جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح ؑ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے؟ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشین گوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آسکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلعم کا تعارف

یامرھم بالمعروف و ینھاھم عن المنکر و یحل لھم الطیبات الایۃ“ ان باتوں کا حوالہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف کے طور پر ہی دیا گیا ہے۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عاید کر دی گئی تھیں۔ ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول کی بعثت پر تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دیں لیکن انہوں نے اپنی شامت اعمال کے سبب سے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مسئلہ پر ہم آل عمران آیت ۹۳ مائدہ آیت ۵ کے تحت بھی لکھ چکے ہیں اور سورہ انعام کی تفسیر میں بھی اس پر وضاحت سے بحث ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی نجات کا انحصار نبی امی پر

فالذین آمنوا بہ الایۃ“ یہ اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو لوگ اس رسول کے بارے میں سابق پیشین گوئیوں کے امین ہیں اور جن کو اس کی بعثت سے یہ سعادت حاصل ہونے والی ہے کہ تمام غیر فطری بندھنوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے سب سے پہلے انہی کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں، مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی یعنی قرآن کی پیروی کریں جو اللہ کی طرف سے دے کر وہ بھیجا گیا۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے، وہی فلاح پانے والے بنیں گے۔ باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

مولانا عبد الغفار حسن
استاذ حدیث، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

درسِ حدیث

(۱) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ

صحیح مسلم مطبوعہ دہلی ج ۱ ص ۶۶

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو گیا پھر اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا تو وہ جنت ہی میں داخل ہو گا

تشریح: اس حدیث کا منشا یہ نہیں ہے کہ محض زبان سے کلمہ طیبہ کہہ دینے سے انسان جنت کا مستحق ہو جاتا ہے خواہ اس کا عقیدہ کچھ ہی ہو۔ بلکہ در اصل یہاں طبیب روحانی نے کلمہ طیبہ کی خاصیت بتلائی ہے۔ جس طرح انسانی بدن کا طبیب کہتا ہے کہ جو جوارش جالینوس استعمال کرے گا اس کا ہاضمہ درست اور جسمانی قوت میں اضافہ ہو گا۔

بظاہر اس قسم کے جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام قاعدہ اور کلی ضابطہ ہے حالانکہ یہاں صرف دوا کی خاصیت اور اس کے اثرات بتلائے جا رہے ہیں۔ طبیب اپنے اس قول میں راست باز سمجھا جائے گا، خواہ ایسے انسان کتنے ہی ملیں جنہوں نے یہ دوا استعمال کرنے کے باوجود شفا نہ پائی ہو۔

ہو سکتا ہے کہ مرض زیادہ شدید اور مزمن ہونے کی وجہ سے دوا کے استعمال میں مداومت اور پابندی ضروری ہو لیکن مریض نے غفلت اور بے پروائی برتی ہو۔ یا کوئی ایسا مانع موجود ہو جس نے دوا کو بے اثر کر دیا ہو بس ٹھیک یہی مثال روحانی طبیب کے اس قول کی ہے جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ اس روایت میں ایک خاص عمل کی خاصیت اور تاثیر بتائی گئی ہے نہ کہ عام قاعدہ اور ضابطہ۔

یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ کلمہ گو ہوتے ہوئے بھی جنت میں داخل نہ ہو سکیں اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں

(۱) کسی ضروری شرط کا فقدان۔
(۲) کسی وجہ سے نیک عمل کی بربادی۔
(۳) کسی مانع (رکاوٹ) کا وجود۔
(۴) کسی ایک ایسی معصیت کا پایا جانا کہ جس کی خاصیت یہی ہو کہ اس کا مرتکب لازماً جہنم میں داخل ہوگا۔

(مستفاد از البدور البازغہ۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

لیکن اگر یہ اسباب و موانع موجود نہ ہوں تو کلمہ طیبہ اپنا اثر دکھائے گا۔ سیرت بدلے گی، افکار و نظریات کا رخ بدلے گا۔ معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق ایک دوسرے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے میں نہایت ہی نمایاں اور خوشگوار انقلاب برپا ہوگا اور آخرت کی جنت سے قبل انسان اس دنیا میں امن و سکون اور عدل و مساوات کی جنت سے ہمکنار ہوگا۔

(۲) عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ الَّذِیْ یُخَالِطُ النَّاسَ وَ یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِیْ لَا یُخَالِطُھُمْ وَلَا یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ (مشکوٰۃ)

(ترجمہ) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ وہ مسلمان جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذا رسانیوں کو برداشت کرتا ہے اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے ملاپ نہیں رکھتا اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر نہیں کر سکتا۔

تشریح: اس روایت سے واضح ہو گیا کہ دین داری اور تقویٰ اس کا نام نہیں ہے کہ انسان گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی اختیار کرے اور دنیا والوں سے بے تعلق ہو کر بیٹھ جائے بلکہ اصل دینداری یہ ہے کہ ان سے ملے جلے۔ ہمدردی، حکمت اور محبت سے ان کی اصلاح کی کوشش میں لگ جائے مگر اس راہ میں کوئی تکلیف پہنچے تو اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

(۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ مَنْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اپنے حریف کو) پچھاڑ دینے سے کوئی شخص پہلوان نہیں ہو جاتا۔ دراصل پہلوان وہی ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

تشریح : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفس کے ہیجان اور خلاف توقع اور خلاف منشا حالات کے پیش آجانے پر صبر اور ضبط نفس سے کام لینا اور جذبات کی رو میں نہ بہنا درحقیقت شجاعت اور مردانگی ہے۔ یہی ضبط نفس صالح سیرت اور متقیانہ زندگی کی جان ہے اور اس کے بغیر زندگی ناہموار اور غیر متوازن ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۴) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَ نَعْلُهٗ حَسَنًا۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ۔

ترجمہ : حضرت ابن مسعود رضؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ انسان اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس خوش نما ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بات بھی تکبر میں شمار ہوگی) آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر در اصل یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھا جائے۔

تشریح : اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ فقیرانہ پھٹے پرانے، میلے کچیلے اور بے سلیقہ لباس پہن لینا تقویٰ اور دین داری نہیں ہے۔ اسی طرح جو شخص بھی حسب حیثیت خوش وضع لباس پہنتا ہے، اس کو مغرور اور متکبر نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ (صحیح مسلم۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الرقاق)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔

تشریح : اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی زندگی گذارتا ہے اور کافر کی طرح شتر بے مہار ہو کر ہر چراگاہ میں منہ نہیں مارتا۔ گویا مومن شرعی حدود کی چہار دیواری میں محبوس ہے اور کافر اس سے آزاد۔

(۶) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا

یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ (بخاری مسلم)

ترجمہ : رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی (مسلمان) کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

(۷) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَخُذُلُہٗ وَلَا یَکْذِبُہٗ وَلَا یَظْلِمُہٗ اِنَّ اَحَدَکُمْ مِرْاٰۃُ اَخِیْہِ فَاِنْ رَاٰی اَذًی فَلْیُمِطْ عَنْہُ (ترمذی)

ترجمہ : ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑے اور نہ اس سے جھوٹ بولے۔ نہ اس پر ظلم کرے اور بے شک تم میں سے ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے اگر اس میں کوئی (اخلاقی یا جسمانی) گندگی دیکھے تو اسے زائل کر دے۔

تشریح : اس روایت میں مومن کو چند باتوں میں آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے

(۱) آئینے کے سامنے انسان اپنے چہرے کے داغ دھبے اور نقش و نگار سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

(۲) آئینہ چہرے کے محاسن و عیوب اتنے ہی بتاتا ہے جتنے کہ فی الواقع اس میں پائے جاتے ہیں اپنی طرف سے ان میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کرتا۔

(۳) آئینہ چہرے کے داغ دھبے اس وقت بتاتا ہے جبکہ چہرہ آئینہ کے سامنے ہوتا ہے۔ لیکن جب چہرہ سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو آئینہ کی زبان بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ آئینہ کسی کے داغ دھبے اور عیب کے تجسس میں کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔

(۴) آئینہ کی زبان عیب و ہنر کے بتلانے میں انتہائی منصف اور بے باک ہے اس معاملے میں وہ اپنے مالک اور محافظ کی بھی پروا نہیں کرتا حالانکہ وہ اسے روزانہ گرد و غبار سے بچاتے ہوئے صاف شفاف کر کے بحفاظت رکھتا ہے۔ بلکہ جو اس سے زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی آئینہ کی تنقید اس پر بے لاگ ہوگی۔ نہ وہ اپنوں کی بے جا رعایت کرتا ہے اور نہ غیروں کی بلا وجہ تحقیر و تنقیص۔

(۵) عام طور پر آئینہ تنہائی میں دیکھا جاتا ہے۔ نصیحت و تنقید کے موقع پر بھی اس پہلو کا لحاظ زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔

(۶) آئینہ کا طرز تنقید اتنا حکیمانہ اور ہمدردانہ ہے کہ کسی کو ناگوار ہی نہیں ہوتا۔ تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ

نہیں ملتا کہ کسی سمجھ دار انسان نے آئینہ کی تنقید سے غضب ناک ہو کر اسے توڑ پھوڑ دیا ہو۔ بلکہ ہر انسان اپنی ظاہری ناہمواریوں کی اصلاح کے لئے اُسے اپنا معاون اور مددگار سمجھتا ہے۔ پس یہی تعلق ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے ہونا چاہیئے۔

(۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ قَالُوْا اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّ صِیَامٍ وَّ زَكٰوةٍ وَّ یَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَ اَكَلَ مَالَ هٰذَا وَ سَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ رضؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے کہا ہم میں مفلس وہ شمار ہوتا ہے جس کے پاس پیسہ نہ ہو نہ سامان۔ آپؐ نے فرمایا میری امّت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز روزے اور زکوٰۃ کا انبار لے کر خدا کے حضور پہنچے گا (لیکن اُس کا حال یہ ہوگا کہ اُس کے خلاف نالش کرنے کے لئے بیسیوں مظلوم آن کھڑے ہوں گے) کسی کو اُس نے گالی دی، کسی پر تہمت لگائی، کسی کا مال اڑایا، کسی کا خون بہایا یا کسی کو زد و کوب کیا۔ اُس کی نیکیاں مظلوموں میں تقسیم ہو جائیں گی اُس کی نیکیوں کے تقسیم ہو جانے کے باوجود اگر پھر بھی اس کے ذمّے حقوق باقی رہ گئے تو مظلومین کے گناہ اس کے سر پہ لاد دیئے جائیں گے اور یہ نمازی صاحب دوزخ کی آگ کا مزا چکھیں گے۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محض نماز روزہ اور ظاہری مراسم عبادت کی پابندی کا نام دین داری اور تقویٰ نہیں ہے بلکہ اصل تقویٰ اور دین داری یہ ہے کہ ان عبادات کے اثر سے انسان کی ہر زندگی کا گوشہ بدل جائے۔ اس کی زندگی سراپا خدا کے رنگ میں رنگ جائے اور معاملات، معاشرت، معیشت، اخلاق اور سیاست میں کامل تبدیلی اور انقلاب برپا ہو جائے۔

حقیقتِ رسالت (۱)

مولانا امین احسن اصلاحی

نبوّت کے لوازم اور نبی کی ذمّہ داریاں

[حقیقت شرک، حقیقت توحید اور حقیقت تقویٰ کی تحریر[1] سے مولانا امین احسن اصلاحی نے خالص قرآنی علم کلام کے جزو اوّل کی تکمیل تو کر لی تھی لیکن بقیہ دو اجزاء یعنی 'حقیقت معاد' اور 'حقیقتِ رسالت' کی تحریر کی نوبت تا حال نہیں آئی اور اب چونکہ مولانا ہمہ تن اور ہمہ وقت صرف تفسیر کی تحریر میں منہمک ہو گئے ہیں لہٰذا جلد اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی ——— تاہم پچھلے دنوں کے کچھ پرانے کاغذات میں سے اتفاقاً مولانا کی دو تقاریر کے NOTES برآمد ہوئے جو کہیں ۱۹۵۹ء میں طلبا کے اجتماعات میں کی گئی تھیں اور جنہیں خالد مسعود صاحب نے قلمبند کر لیا تھا ——— راقم ان NOTES ہی کو غنیمت سمجھ کر ہدیہ ناظرین کر رہا ہے ——— یہ واضح رہے کہ مولانا نے ان پر نظر ثانی فرمانے سے معذوری کا اظہار کیا ہے اور یہ جوں کے توں مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے مصداق پیش کئے جا رہے ہیں ——— اسرار احمدؔ]

حمد و ثنا کے بعد ——— پچھلے ہفتے میں نے جو تقریر کی تھی اس میں آپ کو یہ بتایا تھا کہ وہ کیا ضرورت ہے جس کے تحت نبوّت و رسالت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے شروع کیا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ آدمی کو زندگی کے نشیب و فراز میں رہنمائی دینے کے لئے عقل تنہا کافی نہیں۔ اگر عقل تنہا کافی ہوتی تو عقل میں وہ کمزوریاں اور خامیاں نہ ہوتیں جن کی طرف میں نے پچھلے لیکچر میں اشارہ کیا تھا۔ عقل کی اسی کوتاہی کی وجہ سے نبی اور رسول

---

[1] یہ تینوں کتابیں بھی عرصے سے نایاب ہیں۔ ہم نے تو کلاً علی اللہ ان کی کتابت کا کام تو شروع کرا دیا ہے جب اللہ کو منظور ہو گا یہ تینوں یکجا 'مجموعہ حقائق' کی صورت میں پیش کر دی جائیں گی۔ مدیر

کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کا اصل کام صراط مستقیم کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر آدمی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح پا سکے۔ یہ راستہ خدا کا پسندیدہ راستہ ہوتا ہے، جس سے بھٹک کر انسان کتنی ہی دادیوں میں ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔

جہاں تک نبی کے کام کے شرائط بتانے کا تعلق ہے یہ آسان اور سادہ نہیں کیونکہ نبی کے کام کی نوعیت یہ نہیں کہ وہ محض انگلی سے راستے کا اشارہ کر دے یا صرف کوئی لکھی لکھائی کتاب ہاتھ میں پکڑا دے جس میں یہ لکھا ہو کہ یہ یہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر سکتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جس میں زندگی کے تمام نشیب و فراز اور زندگی کی ہر اونچ نیچ کے بارے میں رہنمائی دی جاتی ہے۔ یہ اس طرح ممکن نہیں کہ کوئی نبی ڈائیجسٹ کی طرح آپ کو ایک نسخہ دے جائے کہ اس سے آپ کی بیماری دور ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طریقے سے دوا بنانے اور نسخہ تیار کرنے میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ چاہیں گے کہ کسی کیمسٹ یا عطار سے مدد لیں ورنہ آپ ٹھوکر کھا جائیں گے۔ اسی طرح زندگی کی پیچیدگیاں اور نشیب و فراز بتانا کوئی آسان کام نہیں کہ صرف انگلی سے اشارہ کر دینے سے ہو جائے۔

یہ کام بہت سے کاموں کا مجموعہ ہے کیونکہ آپ کی زندگی بھی ایک عظیم مجموعہ ہے۔ آپ کی زندگی شخصی بھی ہے اجتماعی بھی۔ آپ کی زندگی میں جذبات بھی ہیں اور خواہشات و تاثرات بھی۔ آپ کی زندگی میں نہ جانے کتنے تقاضے مضمر ہیں اور اس کے کتنے پہلو ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے نبی کا کام بڑا پیچیدہ اور مشکل ہے اور اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتا ہے کیونکہ جب تک سارے پہلوؤں سے رہنمائی نہ ہوگی اس وقت تک انسانیت کے لئے یہ کامل ہدایت نہ ہوگی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بس انجینیرنگ کی کتاب پڑھ کر آپ انجینیر بن سکتے ہیں؟ یا موٹر چلانا اس وقت آجاتا ہے جب موٹر چلانے کے بارے میں ایک کتاب پڑھ لی جائے اور کسی ماہر سے موٹر چلانے کے تمام پہلوؤں کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنا ضروری نہیں؟ اب جو زندگی کہ اتنے گوناگوں پہلو اپنے اندر رکھتی ہے جس میں سماج اور خاندان بھی ہے اور ریاست اور حکومت بھی، اس کے لئے رہنمائی کے لئے تنہا ایک ڈائیجسٹ کا خط ضرورت پوری کر سکتا ہے؟ اس وجہ سے آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی ہدایت کے لئے انبیا کو بھیجا ہے اور انہیں اس سلسلہ میں چند خاص چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے اور چند ذمہ داریاں ہیں جو ان کے سپرد کی ہیں، چند طاقتیں تو اس لئے دی گئیں کہ ان کی مدد سے نبی اپنا کام مکمل کرے اور چند ذمہ داریاں اس لئے عاید کی گئیں کہ ان کے بغیر یہ عظیم کام انجام نہیں پا سکتا تھا۔

جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نبی کو مسلح کرتا ہے وہ تین ہیں :-

(۱) وحی (۲) حکمت اور (۳) عصمت

وحی کی ضرورت صراط مستقیم کے معاملے میں انسانی عقل کی کمزوریوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی براہ راست صحیح رہنمائی کے لئے نبی کو وحی کی طاقت سے مسلح کیا ہے اور یہ ایسا ذریعہ ہے کہ اس میں نبی کو بالکل شبہ نہیں ہوتا۔ نبی کا تجربہ اسے بالکل مطمئن کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے اس کام پر مامور ہوں۔ نبی کو یہ اطمینان کس طرح حاصل ہوتا ہے یہ سوال اس وقت کے زیر بحث موضوع سے خارج ہے۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو بصیرت اور نور عطا فرماتا ہے جن سے اس کو وحی کے مضمرات سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زندگی کے تفصیلی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم متعین کرنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

عصمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے لئے یہ انتظام کرتا ہے کہ وہ وحی کے معاملے میں کسی غلطی میں مبتلا نہ ہو۔ اگر نبی کوئی غلطی کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نبی کو غلطی پر قائم رہنے دے تو پھر تو وحی اور عقل میں کچھ فرق نہ ہوا۔ چنانچہ عصمت کی ضرورت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ نبی صراط مستقیم کی ہدایت کے بتانے میں غلطی نہ کرے اور اگر وہ کسی قرو گذاشت میں مبتلا ہو تو اسے اس پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔

جہاں تک عصمت کا تعلق ہے یہ تمام نبیوں میں مشترک ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جو معصوم نہ ہو لیکن وحی کے معاملہ میں دو شکلیں ہیں۔ یا تو نبی کو براہ راست صرف احکام دیئے جاتے ہیں یا براہ راست کتاب بھی دی جاتی ہے۔ منضبط و مرتب شکل میں وحی خاص خاص نبیوں پر آئی ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ تینوں طاقتیں بالکل عقل کے مطابق ہیں۔

اگر وحی نہ ہوتی تو عقل کو کامل رہنما ہونا چاہیئے تھا لیکن میں پچھلے لیکچر میں بتا چکا ہوں اور اہل فلسفہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ انسانی زندگی میں رہنمائی کے لئے عقل تنہا کافی نہیں ہے۔

اگر عصمت نہ ملتی تو وحی جیسی قطعی چیز بھی مشتبہ ہوتی۔

اگر حکمت نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ زندگی کے سارے معاملات میں رہنمائی کے لئے وحی آتی اور زندگی کے اتنے پہلو ہیں کہ اگر خدا انہیں کتاب کی صورت میں مرتب کرتا تو دنیا کے سارے انسان مل کر بھی اسے بیٹھ کر نہ اٹھا سکتے جیسا کہ قرآن کی طرح کی مختصر کتاب ہوتی جو رمضان کے مہینے ہی میں پڑھی جا سکتی۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ ان تینوں چیزوں میں باہمی تعلق کیا ہے۔

وحی دراصل کتاب زندگی کی ضابطہ بندی کرتی ہے یعنی زندگی کے FOUR CORNERS یعنی ہر گوشے میں اصولی رہنمائی دیتی ہے۔ زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ یہاں ایک فرد کے انفرادی مسائل بھی ہیں۔ پھر خاندان اور قبیلے کے مسائل ہیں۔ پھر قبائل سے ایک قوم بنتی ہے، پھر شہری کی حیثیت سے بھی انسان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور سارے انسان اسٹیٹ کے باشندے کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان تمام معاملات میں وحی رہنمائی کے لئے

بنیادی اصول منضبط کرتی ہے۔

مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیا لباس پہنیں تو اس میں یہ تفصیلات نہیں بتائی گئیں کہ کپڑے کی تراش خراش کیسی ہو بلکہ وہ اخلاقی اصول بتائے گئے ہیں جن سے منشاء الٰہی معلوم کیا جا سکے۔ مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو، جسم کے فلاں فلاں حصّے کو ڈھانپے، ایسا نہ ہو جو جسم کی نمائش کرے۔ مرد مسرفانہ لباس نہ پہنیں، عورتیں اور مرد الگ الگ طرز کا لباس پہنیں لباس ایسا نہ ہو جس سے غرور اور تکبّر نمایاں ہوتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ان بنیادی ہدایات کے بعد چھوڑ دیا گیا کہ انسان اپنی مرضی، پسند اور ضرورت کے لحاظ سے خود لباس بنالے۔

حکمت کا کام یہ ہے کہ یہ وحی کے دیئے ہوئے خاکے میں رنگ بھرتی ہے اور وحی کی عطا کردہ اساسات پر زندگی کے لئے تفصیلی رہنمائی عطا کرتی ہے۔ جس طرح بیو پرنٹ پر سادہ نقشہ بنا ہوا ہوتا ہے، اس میں حدود مقرر کر دی جاتی ہیں کہ ان کے اوپر عمارت تعمیر ہوگی۔ اب اس نقشے کے مطابق عمارت تیار کرنا، اس کے اوپر نقش و نگار کرنا، یہ ایک بالکل دوسرا مرحلہ ہے۔

عصمت ان دونوں کاموں میں نبی کو فروگذاشت سے بچاتی ہے۔

اس طرح تینوں چیزوں سے الگ الگ تین کام لئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم میں سے اگر ایک کام کو بھی ہٹا لیا جائے تو پورا کام تکمیل نہیں پاتا۔ اگر ضابطہ بندی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نقشہ ہی نہیں پھر عمارت کیسے بنے گی۔ اگر رنگ بھرنے کا کام رہ جائے تو عمارت بہت ہی بدہیئت بنے گی اور نگاہوں میں چبھتی رہے گی۔ اگر فروگذاشتوں سے حفاظت نہ ہو تو یہی پریشانی رہے گی کہ معلوم نہیں کہاں غلطی رہ گئی ہوگی اور پوری عمارت نگاہوں میں کھٹکے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں چیزیں نبی کے لئے انتہائی ضروری ہیں اور اس قدر ضروری ہیں کہ خدا کی طرف سے ہی ملنی چاہئیں اسی لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کو ان سے مسلح کرتا ہے۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ یہ تینوں چیزیں آتی کہاں سے ہیں۔

وحی یعنی کتاب کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس میں نبی کے اپنے ذہن، خواہش اور عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ براہ راست نبی کو بتاتا ہے اور نبی بغیر کسی کمی بیشی کے اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

حکمت کا تعلق نبی کی تین چیزوں سے ہے (۱) اس کے دل سے (۲) اس کی زبان سے (۳) اس کے عمل سے۔ دل، زبان اور عمل تینوں میں حکمت ہوگی تبھی اسے حکمت کہا جائے گا۔ عربی زبان میں ان تینوں کی اجتماعی حکمت کا نام ہی حکمت ہے۔ ایک آدمی اگر حکمت کی باتیں کرتا ہے لیکن اس کا عمل خراب ہے تو اسے عربی زبان میں حکیم نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک آدمی کام تو اچھے کرتا ہے مگر عقل اور ذہن میں حکمت

نہیں ہے تو اسے بھلا آدمی کہہ دیں گے مگر حکیم نہیں۔

جب آدمی کے قلب میں حکمت ہو تو اس کی فکر اور خیالات بڑے پتے تلے ہوتے ہیں۔ آدمی خواہشات سے، احساسات سے، جذبات اور ہوس سے مغلوب نہیں ہونے پاتا۔ دل سے وہی بات نکلتی ہے جو پختہ اور صحیح ہو۔ قول میں حکمت ہو تو جو بھی بات منہ سے نکلتی ہے وہ بالکل عقلی ہوتی ہے اور دلائل و براہین کے کیل کانٹے سے لیس ہوتی ہے۔ ایسی مدبرانہ بات زندگی کی نسبت رہنمائی دیتی ہے۔ عمل کی حکمت ہو تو جو قدم بھی آدمی اٹھاتا ہے خواہش اور اتباع ہوا کے بغیر اٹھاتا ہے، اس کا کوئی اعلیٰ محرک ہوتا ہے جو قدم اٹھواتا ہے اور آدمی اسی کی رہنمائی میں چلتا ہے۔

نبیوں کو ان کے مراتب کے لحاظ سے حکمت ملی ہے چونکہ ہمارے نبی خاتم الانبیا تھے اس لئے آپ کو کامل حکمت دی گئی۔ ایسی حکمت جو وحی کی ضابطہ بندی میں نور بھرتی ہے اور زندگی کے نوک پلک درست کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات میں بھی ہمیں معلوم ہے کہ صحیح قدم کون سا ہے۔ طہارت کو لیجئے۔ مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کو لیجئے۔ ملنے ملانے کی تقریبوں کو دیکھئے۔ حتیٰ کہ زندگی کی تمام تفصیلات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی ہمیں ملی ہے۔ آپ نے قلب، قول اور عمل کی حکمت سے زندگی کے ہر پہلو میں رنگ بھر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس پر آپ کوئی داغ، دھبہ یا جھائیں نہیں پائیں گے۔

عصمت کا ایک پہلو تو بیان ہو چکا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نبی کو حکمت عطا کرتا ہے، اسی طرح نبی کی کتاب کو عصمت عطا کرتا ہے یعنی اس میں کوئی تحریف و تغیر نہ ہو سکے گا۔ چونکہ خاتم الانبیاؐ کے بعد وحی کی کوئی ہدایت دنیا میں آنے والی نہ تھی اس لئے آپ کی کتاب کو عصمت عطا کی گئی تاکہ اس میں گڑبڑ نہ ڈالی جائے اور دنیا اس سے محروم نہ ہو جائے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا کوئی نقطہ یا کوئی شوشہ تک اب تک تبدیل نہیں ہو سکا۔ ہر بستی میں ہزاروں آدمی آپ کو ایسے ملیں گے کہ اگر کوئی آدمی قرآن مجید کو غلط پیش کرے تو وہ اپنی اور اس کی جان ایک کر دیں گے لیکن اسے گوارا نہ کریں گے۔ نبی کی کتاب کے علاوہ نبی کی حکمت کو بھی عصمت عطا ہوئی ہے۔ نبی کی کتاب کو جو عصمت عطا ہوئی ہے اس میں کسی کو بحث نہیں مگر نبی کی حکمت کو جو عصمت عطا ہوئی ہے وہ آجکل ایک قابلِ بحث مسئلہ بن گیا ہے۔ انشاء اللہ میں اگلے لیکچر میں اسی پر گفتگو کروں گا۔ کتاب اور حکمت کو عصمت اس لئے دی گئی ہے کہ حضور خاتم الانبیا تھے۔ اس کتاب و حکمت میں خرد برد ہو سکتی ہو تو انسان کو صراطِ کی طرف رہنمائی کون دے اس طرح تو انسانیت بھٹکتی رہے گی۔ نہ جانے کن کن وادیوں میں آوارہ گردی کرے گی۔ نفس اور شیطان نہ معلوم آپ کو کہاں لا کھڑا کریں۔

اس عظیم کام کو انجام دینے اور اس کی تکمیل کے لئے نبی کے ذمہ چند فرائض ہیں۔ اور چند ذمہ داریاں اس کے سپرد کی گئی ہیں یعنی :

(۱) شہادت (۲) تعلیم (۳) تبیین (۴) تزکیہ (۵) انذار (۶) تبشیر

اب میں ان میں سے ہر ایک کا مطلب بتاتا ہوں۔ اس سے آپ کو یہ سمجھ میں آجائے گا کہ نبی کا کام اس طرح نہیں کہ ایک ہرکارہ کی طرح آپ کو ایک خط پکڑا دیا جائے کہ یوں کرو۔ بلکہ اس کے فرائض نہایت گراں اور ذمہ داریاں نہایت کٹھن ہیں۔

شہادت کا مطلب یہ ہے کہ نبی خدا کی طرف سے یہ گواہی دیتا ہے کہ تمہارا رب تمہارے لئے یہ یہ باتیں پسند کرتا ہے اور یہ یہ باتیں ناپسند کرتا ہے۔ زندگی کی صحیح شاہراہ کون سی ہے جو آپ کو دنیا میں بھی فلاح دے اور آخرت میں بھی فلاح نصیب کرے۔ اس شہادت کی کئی شرائط ہیں۔ پہلی یہ کہ نبی کی چاہے کتنی ہی مخالفت کی جائے، اسے دھمکیوں سے مرعوب کیا جائے یا لالچ پیش کیا جائے وہ کسی چیز سے متاثر نہ ہو بلکہ دنیا تک اپنی بات بلاکم و کاست پہنچاتا رہے۔ آپ اس کی مخالفت میں الٹے لٹک جائیں اسے اس کی پروا نہ ہوگی۔ لوگ اسے قتل کر دیں، گھر سے نکال دیں، اس کے ساتھیوں کو ایذا دیں۔ ان کے مال و جائداد ضبط کر لیں مگر وہ بغیر کسی کمی و بیشی کے اپنی بات کی شہادت دے گا اور اس پر قائم رہے گا۔ شہادت کے فریضہ کے متعلق خود قرآن مجید میں بتایا گیا ہے۔ مثلاً وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورہ بقر آیت ۱۴۳) اور دوسری جگہ ہے شاهداً و مبشراً و نذیراً۔ نبی یہ شہادت اپنے قول اور عمل دونوں سے دیتا ہے یہ نہیں کہ قول سے یہ شہادت تو دے کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے مگر اس کا اپنا عمل اس سے مختلف ہو۔ نبی چاہے خلوت میں ہو چاہے جلوت میں ہو اس کے قول اور عمل دونوں سے یہ شہادت یکساں ادا ہوتی ہے بلکہ نبی کی خلوت اس کی جلوت سے بھی زیادہ پاکیزہ ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نبی یہ شہادت علی رؤس الاشہاد دیتا ہے یعنی ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کرتا ہے کہ اس شہادت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش کرتا ہے اور اگر ضرورت پڑ جائے تو اس حق کے لئے جان تک بھی دے سکتا ہے۔ یہ اپنے مسلک، دعوت اور نظریہ پر اس کی اصلی شہادت ہوتی ہے۔

نبی کی دوسری ذمہ داری تعلیم ہے جیسے قرآن میں آتا ہے۔ "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" حقیقت یہ ہے کہ معلم کا کام بڑی مشقت کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ آئے اور کھڑے کھڑے ایک لیکچر دے دے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ پوری کلاس میں ایک ایک طالب علم کے دماغ میں ایک ایک لفظ بٹھا دے۔ انہیں یاد کرائے۔ ان سے سنتا رہے پھر عمل کراتا رہے اور بالآخر امتحان میں پاس کرا دے۔ یہ ساری کی ساری ذمہ داری معلم پر عائد ہوتی ہے۔ جب امتحان لینے والا عالم الغیب ہو تو ظاہر ہے کہ معلم کی کام کس قدر مشقت طلب ہوگا۔ اسی لئے

نبیؐ دن رات اسی فکر میں سرگرداں رہتے تھے اور اس قدر مشقّت کرتے تھے کہ خود قرآن میں یہ حکم آیا ہے کہ تم کیوں ان لوگوں کے پیچھے ہلکان ہوئے جاتے ہو۔ اتنی مشقتیں نہ اٹھاؤ مگر نبیؐ ہیں کہ اسی غم میں گھلے جاتے ہیں۔ دن کو دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی چین نہیں آتا۔ رات کو دعائیں کرتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں کیا کہ ایک رکوع پڑھ دیا ہو اور بس۔ بلکہ آپ نے آدمیوں کی زندگی کے ایک ایک گوشے میں دیکھا کہ ہدایت عمل میں بھی اتری یا نہیں۔ زندگی کی ایک ایک ادا میں آپ نے اس کا اثر دیکھا۔ اگر طالب علم سے کوئی غلطی ہو جائے تو معلّم کو بتانا پڑتا ہے کہ بیٹا بھئی یوں پڑھو۔ نبی کا کام ایک معلّم کے کام سے ہزار گنا بڑا کام ہے کیونکہ اسے کسی کو قاعدہ یا سیپارہ نہیں پڑھانا ہوتا بلکہ زندگی کا سارا سبق دینا ہوتا ہے۔ جذبات ہیں، احساسات ہیں، نظریات ہیں غرضیکہ ہر پہلو سے اپنی تعلیم پیوست کرنی ہوتی ہے۔ پھر نبی کے ذمہ دس بیس بچے نہیں ہوتے، ایک کلاس نہیں ہوتی اور چند گھنٹے کام کے لئے مقرر نہیں ہوتے بلکہ پوری کی پوری امّت ہوتی ہے اور ایک ایک فرد کو تعلیم دینا نبی کی ذمہ داری ہے۔ نبی ایک ایک فرد کی زندگی میں اپنی تعلیم کے اثرات دیکھتا ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم صحابہ سے ان کے روزمرّہ کے حالات دریافت فرمایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کی نوعیت اس طرح کی نہیں کہ جیسے مثلاً میں آیا اور آپ کو آپ کی دلچسپی کے مطابق ایک لیکچر دے دیا بلکہ یوں سمجھیے کہ مثلاً میں آپ کو نیوٹ پر ایک لیکچر دے دوں تو کیا آپ نیوٹ کے ماہر ہو جائیں گے۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ بس آپ لیکچر سن کر ماہر ہو گئے اور آپ کسی ملٹھ یارڈ کے سامنے جا کر کھڑے ہو جائیں تو وہ آپ کے اوسان درست کر دے گا۔ اسی طرح نبی بھی صرف لیکچر ہی نہیں دیتا بلکہ وہ ہر فرد کو ایک ایک چیز محفوظ کرا دیتا ہے۔

تیسری چیز تبلیغ ہے لِتُبَيِّنَ مَا أُنْزِلَ عَلَيْهِمْ۔ وحی صرف FOUR CORNERS متعیّن کرتی ہے۔ تبیین کا مطلب یہ ہے کہ نبی اپنی کتاب کے سارے مضمرات (IMPLICATIONS) و دقائق تمام اسرار اور حقائق کھول کھول کر رکھ دے اور لوگوں کو سمجھا دے۔ اس چیز کا نبی سے میثاق اور عہد و پیمان لیا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ میں نے تم سے اور نوح .... سے میثاق لیا کہ تم کتاب کو واضح کرو گے۔ نبی کتاب کے مضمرات کو چھوڑ نہیں جاتا بلکہ ایسے لوگ تیار کرتا ہے جو ان کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تاکہ باریک سے باریک حقائق کو سمجھنے والے موجود رہیں۔ یہ کام بہت نازک اور پیچیدہ ہے اور نبی کو اس کام کے لئے اہل آدمیوں کو چننا پڑتا ہے۔ ممکن ہے یہ شبہ کیا جائے کہ کتاب مبین کی تبیین سے کیا معنیٰ؟ جو لوگ غلطی سے یہ کہتے ہیں کہ قرآن کتاب مبین ہے اور اسے سمجھنا آسان ہے وہ پھر ساری دنیا کو یہ بھول جاتے ہیں کہ آج تک کسی نے قرآن کو سمجھا نہیں ہم نے کر سمجھا ہے۔ یہ تو خیر ایک الزامی جواب تھا۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر خدا کا کلام ایسا ہی سیاست ہے تو حضرت ابوبکرؓ اور ایک عام بدوی کو برابر سمجھنا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کے مشہور

عالم صحابہ میں چند ایک تھے۔ حضرت عمرؓ آٹھ سال تک سورۂ بقرہ پر غور کرتے رہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ جو کتاب رہتی دنیا تک رہنے کے لئے آئی ہو اسے واقعی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ میں آپ کو غالبؔ کا ایک شعر سناتا ہوں ؎

ابن مریم ہُوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ سارا شعر بالکل آسان ہے۔ کوئی لفظ مشکل نہیں۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ سب لوگ اس شعر کا مطلب برابر سمجھا سکتے ہیں۔ شعر کو آسان کہنا اور بات ہے اور اس کا مطلب بتانا کارِ دیگر ہے اس لئے کسی چیز کے سپاٹ ہونے اور مبین ہونے میں بہت فرق ہے۔ قرآن کے کتاب مبین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عربی مبین میں ہے یعنی عرب کی فصیح و بلیغ اور اعلیٰ و ارفع زبان میں ہے جس میں کوئی اینچ پینچ نہیں بلکہ بامحاورہ اور رواں زبان ہے۔ جب ایک عظیم حکمت اعلیٰ زبان میں بیان کی جا رہی ہو تو آپ بتایئے کہ زبان کا ایک مبتدی اور ایک ماہر اسے ایک جیسا سمجھ سکتے ہیں۔ کیا غالب کی اردو کے معنی کے رموز ایک ماہر اور ایک جاہل برابر سمجھ لیں گے؟ مبین اور سپاٹ میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کریم عظیم ترین حکمت کا ایک اعلیٰ ترین زبان میں کامل ترین نمونہ ہے۔ جب غالب اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ ؎

زیرِ ہر ہر لفظ ما معنیٔ نہ

تو سوچئے کہ خدا کے کلام کے ایک ایک لفظ میں کیا کیا دریا ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ آپ دیکھئے کہ صحیح احادیث کا وہ حصہ جس میں قرآن کریم کے رموز کے بارے میں حضورؐ کے فرمودات ہم تک پہنچے ہیں اسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

تربیت: یعنی نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ احکام بتا دے اور انہیں واضح کرکے بیان کرے اور جا کر سو رہے کہ تم جانو اور تمہارا کام، میں نے تو بات پہنچا دی۔ نبی کا کام اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسا میں ہفتہ میں ایک بار لیکچر دے جاتا ہوں اور اللہ اللہ خیر سلّا۔ اگر مجھ پر آپ لوگوں کی تربیت کی ذمہ داری بھی ہو تو چوبیس گھنٹے آپ کے پاس رہ کر تربیت کرنی پڑے گی۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس لیکچر کے تقاضے کہاں کہاں ابھرے ہیں۔ نبی کو زندگی کے باریک سے باریک گوشہ میں یہ تربیت کرنی پڑتی ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ جہاں تو بات تعلیم کے ذرا بھی خلاف نظر آئی تو اس کو ٹوکنا ہے تاکہ ہر قسم کے داغ دھبے اور برائیاں دور کر دے۔ مثلاً ایک صحابی آ کر نماز پڑھتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ۔ وہ دوبارہ پڑھتے ہیں تو آپ پھر یہی فرماتے ہیں بالآخر آپ انہیں خود فرماتے ہیں کہ یوں نیت باندھو، یوں قیام کرو، یوں رکوع و سجود کرو وغیرہ۔ پھر یہ نہیں کہ یہ تربیت

ایک یا چند افراد کی ہے۔ نہیں بلکہ آپ پر پوری امت کا تزکیہ کرنے کی ذمہ داری تھی۔ اب آپ خود سوچئے کہ نبی کو ڈاکیے کی طرح خالی خط پہنچا دینے والا سمجھ لینے سے بڑھ کر غلط بات کوئی ہو سکتی ہے؟ نبی درحقیقت امت کا مرشد ہوتا ہے۔ وہ تمام افراد کی ایک ایک چیز کا خیال کرتا ہے۔ ہر آدمی اپنا دکھ درد غم اور کمزوریاں اور کوتاہیاں اسی کے پاس آکر بیان کرتا ہے اور ان کے دور کرنے کا طریقہ دریافت کرتا ہے چنانچہ صحابہ رضؓ اپنے خواب تک حضورؐ کو بتاتے تھے اور خواب کی تعبیر حضورؐ خود بتایا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ آپ نے یہ تک بتایا کہ طہارت کس طرح کی جاتی ہے۔ بیت الخلا میں کس طرح جانا چاہیئے کھانا کھانے کے آداب کیا ہیں۔ وغیرہ۔

انذار: نبی صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے، اس کی حقانیت کی شہادت دیتا ہے تعلیم و تبلیغ سے اس کی وضاحت کرتا ہے پھر لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ آخر میں اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس ہدایت کو قبول نہ کرنے والوں کو اس کے نتائج سے خبردار کرے۔ انہیں آخرت کی تباہیوں کا احساس دلائے یعنی نبی ایک نسخہ لے کر آتا ہے اس کے مطابق دوا دیتا ہے اسے مریض کو پلاتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر تم نے بدپرہیزی کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ اسی لئے نبی کو منذر کہا جاتا ہے۔

تبشیر: انذار کے ساتھ ساتھ نبی ہدایت کے ماننے والوں کو بشارت بھی دیتا ہے۔ انہیں یہ بتاتا ہے کہ اگر اس رستے پر چلو گے تو یہ یہ برکتیں اور رحمتیں تم پر نازل ہوں گی۔

یہ دونوں کام نبی اپنی دھونس جمانے کے لئے نہیں کرتا بلکہ وہ حقیقت اور نتائج سے خبردار کرتا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو معلوم نہیں لوگ کب غافل اور بے پروا ہو جائیں۔

ہم سے طلب فرمائیں
مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تصنیف
دعوتِ دین
اور اس کا طریق کار
سائز ۱۸ × ۲۲/۸ صفحات ۲۳۲، طباعت آفسٹ، خوش نما کور، قیمت ۵ روپے
ایک روپیہ محصول ڈاک اس کے علاوہ
دارالاشاعت الاسلامیہ
کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور، فون ۶۹۵۲۲

فلسفے سے تصوّف تک

از قلم

: پروفیسر یوسف سلیم چشتی :

زیر نظر تحریر کی حیثیت ایک باضابطہ مقالے کی نہیں ہے بلکہ اسے 'اشارات علمیہ' قرار دے لیا جائے یا 'افادات چشتیہ' ——— بہرحال ایک مفید اور خیال افزا تحریر ہے جو اپنی افادیت کے پیش نظر ہدیہ قارئین ہے ——— مدیر

(۱)

۱۔ عصر حاضر میں فلسفہ رو بہ زوال ہے اور اس کی بے وقعتی کے اسباب وہی ہیں جو اخلاقی اور روحانی انحطاط کے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہمارا عہد لادینی اور انکارِ خدا کا عہد ہے جس کا منطقی نتیجہ ایک طرف اخلاق اور روحانی انحطاط کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور دوسری طرف ہر ماورائی تصوّر سے عدم دلچسپی اور اعراض کی صورت میں

۲۔ کانٹ نے عقل سے اپیل کرکے انسانی علم کی حدود معین کر دیں۔ اُس نے بتایا کہ عقل کس حد تک علم حاصل کر سکتی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ عقل خالص مابعد الطبیعاتی مسائل میں غور و فکر نہیں کر سکتی۔ چنانچہ حسب ذیل سوالات کا جواب نہیں دے سکتی :-

(ا) اس کائنات کا کوئی صانع یا موجد ہے یا نہیں ؟ (خدا)

(ب) انسان مختار ہے یا نہیں ؟ (اختیار)

(ج) نفس ناطقہ باقی ہے یا نہیں ؟ (بقاء نفس)

عقل ان سوالوں کا نہ اثباتاً جواب دے سکتی ہے نہ نفیاً۔ اسی لئے فلسفۂ محض کی منطقی انتہا مسلکِ لاادریت ہے اور میرے ہر سہ اساتذہ (شنکر اچاریہ، شیخ اکبرؒ اور بریڈلے) کا بھی یہی مذہب ہے[1]

واضح رہے کانٹ کے اس دعوے کا تاحال کسی فلسفی نے کامیاب ردّ نہیں کیا ہے۔

۳۔ REALISM کے حامی بھی جو کائنات کو اسی طرح حقیقی سمجھتے ہیں جس طرح IDEALISM کے حامی خدا کو بدرجۂ اولیٰ معترف ہیں کہ مابعد الطبیعیات سے ہمیں قابل اعتماد علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ جدید فلاسفہ کانٹ کی طرح "عقل محض" کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے وہ اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ عقل فلسفے کے انتہائی مسائل سے تعرض نہیں کر سکتی۔ یعنی وہی کیوں؟ کیسے؟ کہاں سے؟ کہاں کو؟ وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ فختے، شیلنگ اور ہیگل نے کہا کہ مابعد الطبیعیاتی حقیقت کا علم بذریعہ وجدان حاصل ہو سکتا ہے لیکن یہ فلاسفہ خود وجدان سے محروم تھے کیونکہ عارف نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے وجدانی علم کی صحت پر اپنے واردات قلبی کو بطور دلیل پیش نہیں کیا بلکہ اسی عقل کا سہارا لیا جو حواس کی محتاج ہے۔ ماضی قریب میں برگسوں نے (INSTINCTION) وجدان کو صحیح علم حقیقت کا ذریعہ قرار دیا مگر وہ بھی اس صفت سے محروم تھا۔ اس نے اپنی کتاب تخلیقی ارتقا میں وجدان کو ذریعہ حصولی علم قرار دیا ہے۔ مگر ثبوت میں واردات قلبی کے بجائے عقلی دلائل دیتے ہیں۔ حالانکہ وجدانی علم کا ثبوت تصوری (CONCEPTUAL) علم سے نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ولیم جیمس نے بھی اپنی کتاب انواع واردات قلبی (VARITIES OF REL. EXPERIENCE) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عقلی دلائل سے واردات قلبی کا اثبات ناممکن ہے۔

(۲)

فلسفے کے مقابلے میں مذہب کا مقصد انسان کے باطن میں انقلاب پیدا کر کے اس کے وجود یعنی اس کی شخصیت کا ترفع ہے۔ اس کو حیات نو بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس کی طرف اقبال نے جاوید نامہ اور دوسری کتابوں میں واضح اشارات کئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی تعلیم پر عمل کرنے سے انسان طلسم زمان و مکاں کو باطل کر سکتا ہے۔ شعور کی حدود کو توڑ سکتا ہے اور اس کا طریقہ استدلال نہیں ہے بلکہ مراقبہ ہے[۲]

---

[۱] (حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی اس رائے میں مجھ سے متفق ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں

"SHANKIRA IN THE EAST AND BRADLEY IN THE WEST ADOPT THIS WISE ATTITUDE OF AGNOSTICISM

'HINDU VIEW OF LIFE' P. 49

[۲] CONCENTRATION, CONTEMPLATION, MEDITATION

بقول اقبال ؎ چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور

اگر انسان علم باطن کی بلند حالت تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے اپنے موجودہ شعور کے قید خانے سے باہر نکلنے کی جد و جہد کرنی لازمی ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اسے مجاہدہ کہتے ہیں۔

موجودہ شعور تو صرف تصوراتی (CONCEPTUAL) علم کو واحد اقلیم تجربہ قرار دیتا ہے لیکن ایک تعلیم اس سے اوپر بھی ہے جس تک رسائی صرف مراقبے سے ممکن ہے۔ مراقبے سے اس عالم تک رسائی ہو سکتی ہے جو حواس کے عالم سے بالاتر ہے۔ حقیقت تک رسائی مراقبے سے ہو سکتی ہے۔

گر بدیدے حس جیوان شاہ را پس بدیدے گاؤ خر اللہ را

اگر انسان محسوسات سے بالاتر ہو جائے (اور اسے ویراگ کہتے ہیں) تو اسے نئی زندگی حاصل ہو سکتی ہے جسے ولادت ثانیہ کہتے ہیں۔

جس طرح جنین رحم مادر کی حدود سے باہر نکل کر نئی دنیا میں آجاتا ہے اسی طرح انسان اس عالم زمان و مکان کی حدود سے باہر نکل کر ایک نئی دنیا میں آجاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اسے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے اور اسے نظر آتا ہے کہ میں حقیقت کبریٰ کا پرتو ہوں یعنی مظہر ذات حق ہوں۔

۲۔ دور حاضر میں انسان اپنے موجودہ علم میں صرف روحانی ارتقا کی بدولت اضافہ کر سکتا ہے۔ عقلی استدلالات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ فلسفے کی تاریخ گواہ ہے کہ عقل کی مدد سے انسان آج تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ خدا کے ساتھ میرا رشتہ کیا ہے ؟ یا خدا کا مجھ سے کیا رشتہ ہے ؟ کائنات سے کیا رشتہ ہے ؟

اب کسی نئے نظام فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شعور میں انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ انقلاب مراقبے سے برپا ہو سکتا ہے۔ روحانی عروج کیا ہے ؟ زمان و مکاں کی قیود سے بالاتر ہو جانا اور یہ عروج مراقبے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دگر جب تک ایک فلسفی مسلک تصوف اختیار نہیں کرے گا وہ حقیقت کبریٰ کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح ۳ ہزار سال سے ٹھٹک رہا ہے آئندہ بھی اسی طرح سرگرداں رہے گا ؎

بو علی اندر غبار ناقہ گم دست رومی پردۂ محمل گرفت

مقصد حیات تو مشاہدہ ہے یعنی مشاہدۂ حقیقت اور یہ مقصد فلسفے (عقل) سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ فلسفے کا مقصد حقیقت کی تلاش ہے مگر چونکہ فلسفہ عقل پر اعتماد کرتا ہے۔ اس لئے اب تک ناکام رہا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

امام غزالی نے صحیح لکھا ہے کہ جس قدر اونچے پہاڑ پر چڑھتے جاؤ گے، اسی قدر دور تک دیکھ سکو گے لہذا شعور (علم بالحواس) سے اوپر چڑھو، شاید لیلیٰ کو دیکھ سکو۔ ظاہری آنکھ کے بجائے باطنی آنکھ سے دیکھنا سیکھو۔ حکیم وہ ہے جس کی باطنی آنکھ روشن ہو جائے۔ یہی سچی حکمت ہے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

صداقت (TRUTH) عقل کے بجائے حکمت سے منکشف ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لئے مراقبہ یا بالفاظ دیگر خودی میں غوطہ لگانا لازمی ہے ع

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی!

۳۔ اب وقت آگیا ہے کہ فلسفی زندگی کے حیاتیاتی ارتقاء (BIOLOGICAL EVOLUTION) اور روحانی ارتقاء میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ یعنی دماغ کی قوتوں کو ترقی دینے کے بجائے خودی کی مخفی قوتوں سے آگاہی حاصل کرے۔

انسان اپنے ماحول اور اس کائنات سے ابھی تک ہم آہنگ نہیں ہو سکا کیونکہ وہ ابھی تک خالق کائنات سے یعنی اس کی مشیت سے ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکا اور جب تک دل بیدار نہ ہو، یہ ہم آہنگی ممکن نہیں ہے کیونکہ عقل مشیت ایزدی کا ادراک ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا آلہ دل ہے نہ کہ عقل۔

خدا عقل میں نہ سماتا ہے نہ سما سکتا ہے مگر دل میں سما سکتا ہے۔

در دل مومن بگنجم اے عجب (ولکن یعنی قلب مومن)

جب تک روحانی ارتقاء عام نہ ہوگا۔ دنیا میں نہ پائدار تہذیب قائم ہو سکتی ہے نہ امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔

جب تک روحانی بیداری (دل کی بیداری) ع مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری! عام نہ ہو، بنی آدم کا روحانی ارتقاء نا ممکن ہے اور روحانی بیداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک روح کا رابطہ اللہ سے استوار نہ ہو، اور یہ رابطہ استوار ہو سکتا ہے صحبت اہل اللہ سے، چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا ہے۔ یعنی ؎

می نروید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندان دل

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

طاؤس الفقراء ابو نصر سراج (۴)

م ۳۷۸ھ

انتخاب از کتاب اللمع

فہرست مضامین اور خلاصۂ مطالب[1] سے قارئین کو اس کتاب کی اہمیت کا کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا اس کے بعد ذیل میں اس کتاب سے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں تاکہ انہیں کتاب سے مزید واقفیت حاصل ہو سکے۔

باب فی ذکر اصحاب رسول اللہ صلعم و معانیھم رضی اللہ عنہم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا " وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۹ — ۱۰۰)

اور مہاجرین اور انصار میں سے جن لوگوں نے (قبولِ اسلام میں) سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے اور وہ لوگ جو ان کے بعد خلوص دل سے داخل اسلام ہوئے، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سب مہاجرین سے راضی ہو گیا اور اللہ نے گواہی دی کہ مہاجرین اور انصار اللہ سے راضی ہو گئے اور یہ سابقون (مہاجرین والانصار) ہی دراصل المقربون کا مصداق ہیں اور ہم مقربین کا مفہوم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں اور اللہ کے اس قول (رضی اللہ عنہم) کو سمجھنے

---

[1] شائع شدہ "میثاق" از اگست تا دسمبر ۱۹۷۰ء

[2] اس صراحت کے باوجود جو بعض مہاجرین کو کافر یا منافق قرار دے وہ بلاشبہ منکر قرآن اور دائرہ اسلام سے خارج ہے تفصیل کے لئے دیکھو مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ۔

کے لئے اس آیت پر غور کرو" وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ " اور جان لو کہ اللہ کا کسی سے راضی ہو جانا اس کے حق میں سب سے بڑی نعمت ہے تو معلوم ہوا کہ مہاجرین اور انصار کو سب سے بڑی نعمت حاصل ہو چکی ہے (اور اس کے فقدان یا زوال پر سارے قرآن میں کوئی نص موجود نہیں ہے)

ذوالنون مصری رح نے کہا ہے کہ جب اللہ نے یہ کہا کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے تو یہ بات اس کے علم ازلی میں طے شدہ تھی کہ وہ اللہ سے ہمیشہ راضی رہیں گے اسی لئے اللہ ان سے ہمیشہ راضی رہے گا۔

اور آنحضرت صلعم نے فرمایا " اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ " میرے صحابہ رض ستاروں کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے آنحضرت صلعم نے یہاں نجوم کا لفظ استعمال فرمایا ہے نہ کہ "کواکب" کا کیونکہ کواکب بہت چھوٹے ہوتے ہیں ان کی روشنی کسی کو راہ نہیں دکھا سکتی اور ہدایت کو اقتدا سے مشروط فرمایا ہے یعنی حصول ہدایت ان کی اقتداء (اتباع) پر موقوف ہے نیز اقتداء ظاہری معانی کے علاوہ باطنی معانی میں بھی لازمی ہے۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے "میری امت میں، میری امت پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے (حضرت) ابوبکر (صدیق رض) ہیں اور اللہ کے دین میں تمام امت میں سب سے زیادہ قوی (حضرت) عمر رض ہیں اور حیا کے لحاظ سے اصدق (حضرت) عثمان رض ہیں اور سب سے زیادہ عالم فرائض (حضرت) زید رض ہیں اور حرام و حلال کے سب سے زیادہ عالم (حضرت) معاذ ابن جبل رض ہیں اور سب سے زیادہ علم قرأت جاننے والے (حضرت) ابی ابن کعب رض ہیں اور سب سے بڑے قاضی (حضرت) علی رض ہیں اور نہیں سایہ کیا آسمان نے اور نہیں ٹھکانا دیا زمین نے (حضرت) ابوذر رض غفاری رض سے بڑھ کر کسی راست باز کو" نیز آنحضرت صلعم نے فرمایا " اے لوگو! میری وفات کے بعد (حضرت) ابوبکر رض اور (حضرت) عمر رض کی اقتداء کرنا" اس ارشاد میں آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر رض کو حضرت عمر رض پر فوقیت عطا فرمائی اور مجھے یہ بات ابوعتبہ الحلوائی رح سے پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا "کیا میں تمہیں صحابہ کرام رض کے حال سے آگاہ کروں؟ ان کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ سے ملاقات کو اپنی دنیاوی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں سے بالکل خائف نہیں ہوتے تھے خواہ وہ کثرت میں ہوں یا قلت میں۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ دنیا میں تنگ دستی سے ہراساں نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے رزق کا ذمہ لے لیا ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ اگر ان میں طاعون کی وبا ظاہر ہوتی تھی تو بھی وہ اپنے فرائض میں تندہی سے مصروف

رہتے تھے یہاں تک کہ وہ دنیا ختم ہو جاتی تھی (مطلب یہ ہے کہ وہ موت سے خائف نہیں تھے)

باب ذکر ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ و تخصیصہ من بین اصحاب رسول اللہ صلعم بالاحوال التی تحقق بہا اہل الصفوۃ من ہذہ الامۃ

مطرف بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اگر آسمان پر کوئی منادی یہ ندا کرے کہ جنت میں صرف ایک شخص داخل ہوگا تو مجھے اپنے رب کے لطف و کرم سے یہ رجا (امید) ہے کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں گا اور اگر وہی منادی یہ ندا کرے کہ دوزخ میں صرف ایک آدمی داخل ہوگا تو خشیۃ اللہ کی بنا پر میں یہ اندیشہ کروں گا کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ کہہ کر مطرف نے کہا واللہ یہ اعظم الرجا اور اعظم الخوف کی دلیل ہے اور ایمان جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں ہمیشہ بین الخوف والرجاء ہوتا ہے۔

ابو العباس بن عطاءؒ سے مروی ہے کہ مجھ سے لوگوں نے پوچھا کہ "کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ" کا کیا مطلب ہے؟ (۳-۷۹) تو میں نے جواب دیا کہ اس کا در اصل مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح ہو جاؤ (جو بالکل ربانی یا اللہ والے ہو گئے تھے) اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے وفات پائی تو آپؐ کی وفات کے صدمے سے تمام صحابہؓ کے قلوب مضطرب ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ کا قلب وفات النبیؐ سے مطلق مضطرب نہیں ہوا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کے چہرہ مبارک کی زیارت کے بعد وہ مسجد نبوی میں آئے اور منبر پر بیٹھ کر یہ تاریخی خطبہ دیا" اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمد (صلعم) کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ محمد (صلعم) وفات پا گئے اور تم میں جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو (اسے اطمینان ہونا چاہئیے کہ) اللہ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی" بس "ربانی" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایسا (اللہ والا) ہو جائے کہ حوادث روزگار اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں اور ابوبکر واسطیؒ نے کہا ہے کہ امت محمدیہؐ میں پہلا شخص جس نے تصوف کے رنگ میں کوئی بات کی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ جب جیش عسرت کی تجہیز کے موقع پر صدیق اکبرؓ نے اپنا سارا مال و اسباب اور گھر کا سامان (اثاث البیت) حضور انور صلعم کی خدمت میں لا کر حاضر کر دیا (صندوق، پلنگ، بستر، لحاف، توشک، چادر، تکیہ سینی، تسلا، توا، کڑھائی، گیہوں، چاول، کھجور، اونٹ، گھوڑے، خچر، نوکر چاکر، کنیز، غلام، نقدی، سونا چاندی، درہم و دینار، شمعدان، ظروف، آلات و سامان آرائش، حتیٰ کہ جملہ پارچہائے پوشیدنی)

تو حضورؐ نے اُن سے پوچھا "ابقیت خلفت لعیالک؟" تو نے اپنے بیوی بچوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ تو انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "اللہ و رسولہ" پھر دوبارہ کہا "اللہ اور اس کے بعد رسولہ" واسطی کہتے ہیں کہ میں اپنی جان کی قسم کھا کر یہ بات کہتا ہوں کہ حضرت صدیق رضؓ کے اس جواب میں حقائق و معارف کی ایک دنیا پوشیدہ ہے اور اہل تفرید و تجرید کے لئے بہت سے فوائد پنہاں ہیں اور اہل توحید کے لئے بڑے اشارات مخفی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ ہی یہ جواب دے سکتے تھے۔

اسی طرح جب غزوۂ بدر سے قبل بوقتِ شب حضور انور صلعم اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے (اور حضرت عمرؓ شمشیر بکف آپؐ کی حفاظت پر ایستادہ تھے) تو جس وقت آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں یہ عرض کی "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد فی الارض من بعد ذلک" اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو آج کے بعد تمام دنیا میں کوئی شخص تیری عبادت نہیں کرے گا۔

آپؐ انتہائی دارفتگی کے عالم میں انہی الفاظ کی تکرار فرما رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر صدیق اکبرؓ (جو سائبان کے دروازے پر کھڑے تھے) اندر آئے اور ردائے مبارک کو جو دوش مبارک سے سرک کر نیچے گر پڑی تھی دوبارہ ٹھیک کیا اور کمال تمکین و وقار سے بارگاہ رسالتؐ میں یوں گویا ہوئے "دع مناشدتک ربک فانہ واللہ منجز لک ما وعدک او کما قال" بس کیجئے! اپنے رب سے اس قدر الحاح و زاری کے ساتھ مناجات نہ کیجئے کیونکہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ خدا اُن وعدوں کو جو اس نے آپؐ کے ساتھ کئے ہیں ضرور پورا کرے گا (یا اسی مضمون کے دوسرے الفاظ کہے)

صدیق اکبرؓ نے اللہ کے جس وعدے کی طرف اشارہ فرمایا وہ یہ تھا "اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین امنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب" (۸-۱۲) جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو جو ایمان لے آئے ان کو ثابت قدم رکھو۔ میں ان کے دلوں میں جو کافر ہیں (مومنوں کا) رعب ڈال دوں گا۔

بہرحال یہ بات صدیق اکبرؓ کے ایمان کی پختگی پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت پر کامل یقین تھا اسی لئے انہوں نے آنحضرت صلعم کو تسلی دی۔ اگر کسی کو یہاں یہ شبہ لاحق ہو کہ کیا آنحضرت صلعم کو اللہ کی نصرت پر کامل یقین نہیں تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم حضرت صدیقؓ کے

مقابلے میں اللہ کی زیادہ معرفت رکھتے تھے اور حضرت صدیق اکبرؓ تمام صحابہؓ کے مقابلے میں بلحاظ ایمان زیادہ قوی تھے۔ صدیق اکبرؓ کا ثبات ان کے ایمان کی حقیقت کی بنا پر تھا اور آنحضرت صلعم کا اضطراب آپؐ کے علم باللہ کی زیادتی کے سبب سے تھا۔ آپؐ بمقابلہ صدیق اکبرؓ اللہ کو زیادہ جانتے تھے اور اس لئے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ مبادا اللہ اپنی شان بے نیازی دکھا دے اور مجھ سے بے پروا ہو جائے۔ حضور انور صلعم اللہ کے بارے میں وہ بات جانتے تھے جو صدیق اکبرؓ نہیں جانتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب آندھی چلتی تھی تو حضورؐ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ حالانکہ صحابہ رضؓ میں سے کسی کے چہرے کا رنگ متغیر نہیں ہوتا تھا۔ نیز حضور انورؐ نے فرمایا "اگر تم لوگ بھی وہ باتیں جانتے ہوتے جو میں جانتا ہوں تو ہنستے کم اور روتے زیادہ" اور گھروں کو چھوڑ کر صحرا کی طرف نکل جاتے اور اللہ کی ہمسائیگی اختیار کر لیتے اور ہرگز اپنے اپنے بستروں پہ آرام نہ کرتے۔"

صدیق اکبرؓ کو صحابہ رضؓ کی جماعت میں فراست اور الہام کے لحاظ سے بھی خصوصیت حاصل ہے جس کا اظہار تین مواقع پہ ہوا۔ پہلا موقع اس وقت آیا جب تمام صحابہ رضؓ کی رائے صدیق اکبرؓ کی رائے سے متفق ہو گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضورؐ کی وفات کے بعد اکثر قبائل اسلام سے برگشتہ ہو گئے اور اکثر قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو تمام صحابہ رضؓ کی یہ رائے تھی کہ اہل ردہ یعنی مانعین زکوٰۃ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے خلاف جنگ نہ کی جائے کیونکہ حالات اس کے متقاضی نہیں ہیں لیکن صدیق اکبرؓ نے کہا اگر تم لوگ میرا ساتھ نہیں دوگے تو میں تنہا جہاد کروں گا اور اس معاملے میں اتنی سختی سے کام لوں گا کہ اگر کوئی مسلمان زکوٰۃ کے اونٹ کے گلے کی رسی بھی روک لے گا تو اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ چنانچہ جب صحابہ رضؓ نے ان کا یہ ثبات دیکھا تو سب ان کی رائے سے متفق ہو گئے۔

دوسری مرتبہ ان کی فراست کا اظہار اس وقت ہوا جب صحابہ رضؓ نے ان سے کہا کہ چونکہ اہلِ عرب نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اس لئے جیشِ اسامہ رضؓ کی روانگی کو ملتوی کر دیجئے۔ یہ سن کر آپ نے جواب دیا کہ واللہ میں اس پرچم کو نہیں کھولوں گا جس کو حضور سرکار دو عالم صلعم نے اپنے دست مبارک سے باندھا ہے خواہ کچھ ہو جائے میں حضور انورؐ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ تیسرے موقع پر ان کے صاحب الہام ہونے کا ثبوت ملا جب انہوں نے اپنی بیٹی ام المومنین سیدۃ النساء حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہ کہا کہ میں تمہیں ایک اچھا تحفہ دوں گا اور وہ تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس وقت نہ سمجھ سکیں کہ دو بہنیں کیسے ہوں گی جبکہ اس وقت دو بھائی اور صرف ایک بہن تھی لیکن صدیق اکبرؓ کی ایک زوجہ حاملہ تھیں اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے تعجب کو دور کرنے کے لئے ان سے کہا

کہ میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ اس کے شکم میں لڑکی ہے چنانچہ لڑکی ہی پیدا ہوئی۔ اسی معنی میں فرمایا آنحضرت صلعم نے "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"

حضرت بکر بن عبد اللہ المزنی رح نے کہا کہ صدیق اکبر رضؓ کو تمام صحابہ رضؓ پر جو فضیلت حاصل تھی اس کی وجہ کثرت صلوٰۃ و صوم نہ تھی بلکہ وہ شے تھی جو ان کے سینے میں تھی یعنی یقین کامل۔ حضورؐ کی نبوت پر یقین کامل۔ اللہ کی ہستی پر یقین کامل۔ بعض صحابہ رضؓ نے کہا کہ صدیق اکبر رضؓ کو تمام صحابہ رضؓ پر اس لئے فضیلت حاصل تھی کہ وہ تمام صحابہ رضؓ سے زیادہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتے تھے۔

مروی ہے کہ جب نماز کا وقت آتا تو صدیق اکبر رضؓ لوگوں سے کہتے کہ اے لوگو اس آگ کو بجھانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ جسے تم نے سلگایا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں نوالہ جو میں نے کھایا تھا وہ مشتبہ تھا تو میں فوراً استفراغ کروں گا خواہ اس کے ساتھ میری جان کیوں نہ نکل جائے کیونکہ میں نے خود آنحضرت صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جس بدن کی پرورش مال حرام سے ہوئی وہ ضرور دوزخ میں جلے گا" اس لئے میں مال حرام سے اجتناب کرتا ہوں۔

کبھی کبھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ "کاش میں گھاس ہوتا اور مجھے چوپائے کھا جاتے اور مجھے نہ حساب کا ہول ہوتا نہ عذاب کا خوف ہوتا" نیز فرمایا "قرآن حکیم کی تین آیتوں پر میں نے خاص طور سے عمل کیا ہے پہلی آیت یہ ہے:

"وَ إِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَ إِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهٖ" اور اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی اس مصیبت کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ اللہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی اس کے فضل و کرم کو رد کرنے والا نہیں ہے پس میں نے اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اللہ میرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو کسی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اس بھلائی کو مجھ سے روک دے۔

دوسری آیت یہ ہے "فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ" اے میرے بندو! تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا" پس میں اللہ کی یاد میں مشغول ہو گیا اور اللہ کی یاد کے سوا سب کی یاد دل سے نکال دی۔ اور تیسری آیت یہ ہے "وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا" اور روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو پس میں طلب رزق سے بے فکر ہو گیا اور اللہ کی اطاعت میں مشغول ہو گیا۔

یہ تین اشعار آپؓ سے منسوب ہیں:

"اے وہ شخص جو دنیا اور اس کی زینت کے ذریعے سے سربلندی حاصل کرنی چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کہ ترفع اور سربلندی، اینٹ پر اینٹ رکھنے (محلات تعمیر کرنے) سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر تو انسانوں میں شریف انسان کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس بادشاہ کو دیکھ جو مسکینوں کا سا لباس پہنے ہوئے ہو۔ یہی ہے وہ آدمی جو دراصل اپنی رافت کی بنا پر انسانوں میں عظمت کا مستحق ہے اور یہی ہے وہ آدمی جس کی دنیا بھی سنور گئی اور عقبیٰ (آخرت) بھی سنور گئی۔

جنیدؒ کہتے ہیں کہ توحید کے باب میں اشرف کلمہ وہ ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ کی زبان سے نکلا "سُبْحَانَ مَنْ لَمْ یَجْعَلْ لِخَلْقِہٖ طَرِیْقًا اِلٰی مَعْرِفَتِہٖ اِلَّا الْعَجْزَ عَنْ مَعْرِفَتِہٖ" پاک ہے وہ ذات (خدا) جس نے مخلوقات کو اپنی معرفت کا کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں بتایا کہ اس کی معرفت سے عاجز ہونے کا اعتراف کرلے۔ (کتاب اللمع ص ۱۲۱ تا ۱۲۴)

مسلک فی الاصول یعنی اصول مذہب القوم

حضرت جنیدؒ کا قول ہے کہ اہل العلم اس بات پر متفق ہیں کہ تصوف کی عمارت پانچ اصولوں پر قائم ہے (۱) دن کو روزہ رکھنا (گاہے گاہے ناغہ کر دینا) (۲) رات کو قیام کرنا (۳) اخلاص العمل (۴) الاشراف علی الاعمال لبطول الرعایۃ (۵) والتوکل علی اللہ فی کل حال

حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے کہا ہے کہ ہمارے مسلک کے اصول سات ہیں (۱) التمسک بکتاب اللہ (۲) اقتداء برسول اللہ صلعم (۳) اکل الحلال (۴) کفّ الاذی (دوسروں کو ایذا دینے سے اجتناب) (۵) اجتناب الآثام (گناہوں سے بچنا) (۶) توبہ (۷) اداء الحقوق (اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنا)

بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ وہ سات اصول یہ ہیں:-

(۱) اداء الفرائض (۲) اجتناب المحارم (۳) قطع العلائق (۴) معانقۃ الفقر (مسلک فقر اختیار کرنا) (۵) ترک الطلب (خواہش نفس سے قطع نظر) (۶) ادّخار لوقت ثان (دوسرے دن کے لئے ذخیرہ کرنا) (۷) انقطاع الی اللہ۔

دعاء للجنیدؒ

مصنف نے بعض مشائخ کی دعائیں بھی باب الدعوات میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے حضرت جنیدؒ کی دعا جو کتاب المناجات سے مستخرج ہے، ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"اللّٰھمّ انّی اسئلک یا خیر السّامعین و بجودک ومجدک یا اکرم الاکرمین و بکرمک و فضلک یا اسمع السامعین و باحسانک و رافتک یا خیر المعطین اسئلک سؤال خاشع خاضع متذلل متوازع ضارع اشتدت الیک فاقته و انزل بک علی قدر الضرورة حاجته و عظمت فیما عندک رغبته و علم ان لا یکون شیٔ الا بمشیئتک ولا یشفع شافع الیک الا من بعد اذنک نکم من تبیح قد سترته و کم من بلاء قد صرفته و کم من عثرة قد اقلتها وکم من زلة قد سھلت بھا وکم من مکروہ قد رفعته وکم من ثناء قد نشرته اسئلک یا سامع اصوات المستغیثین و عالم خفی اضمار الصامتین و مطلع فی الخلوات علی افعال المتحرکین و ناظر الی صادق وجل من اثار الساعین اسئلک ان لا تحجب بسوء فعلی عنک صوتی ولا تفضحنی بخفی ما اطلعت علیه من ستری ولا تعاجلنی العقوبة علی ما عاملته من خلوا فی رکن بی فی کل الاحوال رائفا" و علیّ فی کل الاحوال عاطفاً ..... واسرح بذالک الیک فی میادین المسابقة وارزقنی من طعم ذلک اللذائذ السابقة یا اکرم الاکرمین۔

ایک شخص نے ابراہیم بن شیبانؒ سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ انہوں نے کہا "ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہو اور اس سے کبھی غافل نہ ہونا اور اگر یہ بات نہ ہو سکے تو کم از کم اپنی موت سے غافل نہ ہونا"۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر موت کو یاد کرو گے تو یقیناً اللہ کی یاد دل میں پیدا ہو جائے گی۔ (کتاب اللمع صفحہ ۲۶۶)

تبصرہ

کتاب اللمع کے مطالب کا خلاصہ پڑھ لینے کے بعد ہر صاحب دانش و بینش کے دل پر اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت واضح ہو جائے گی۔ اس کتاب کی خصوصیات ابتدا میں بیان کی جا چکی ہیں۔ اس مختصر تبصرے میں صرف اس کی سب سے بڑی خصوصیت کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرتی

چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کے آخری حصے میں اُن تمام غلط عقائد کی نشاندہی کر دی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں بعض صوفیوں میں راہ پا گئے تھے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو انہوں نے انجام دی۔ مصنف نے صرف نشاندہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام غلط عقائد کا ابطال بھی کر دیا ہے اور یہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے تمام طالبانِ حق ان کے ممنونِ احسان رہیں گے۔

ان عقائد باطلہ کی تصریح سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ تصوف کا سرچشمہ چوتھی صدی ہجری ہی میں مکدر ہو گیا تھا اور یہ کدورت آج بھی موجود ہے۔ اگرچہ صوفیائے متاخرین نے اس کدورت کے ازالے کی حتی الوسع کوشش کی مگر انہیں پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ناکامی کے اسباب بہت پیچیدہ ہیں جن کی تفصیل کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے۔ صرف اتنا اشارہ کر سکتا ہوں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت طبعاً شخصیت پرست واقع ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت طبعاً عقل کے بجائے جذبات کی محکوم ہے۔ عقل کی بات لاکھوں میں صرف دو چار آدمیوں ہی کو اپیل کر سکتی ہے۔

تاریخ عالم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ ہر زمانے میں عوام الناس نے ذاتی اہلیت وصلاحیت کے مقابلے میں نسب کے تعلق کو ترجیح دی ہے۔ اگرچہ ہادیان و بانیان مذاہب نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ بزرگی کا معیار نسب نہیں ہے بلکہ ذاتی خوبی (تقویٰ) ہے مگر ان کی وفات کے بعد ان کے متبعین نے اس زرّیں قانون کو مدنظر نہیں رکھا اور ان کا جذبہ شخصیت پرستی ان کی عقل پر غالب آ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے افضل اور اصلح کے بجائے اس شخص سے اپنا رشتہ عقیدت و مودت استوار کر لیا جو بانی مذہب سے صلبی رشتہ رکھتا تھا اور اس غلط طریق کار کو جائز قرار دینے کے لئے انہوں نے یہ مفروضہ تراشا اور اسے بطور صداقت تسلیم کر لیا کہ بیٹے یا پوتے یا نواسے میں باپ یا دادا یا نانا کے ذاتی کمالات بعینہٖ و بجنسہٖ منتقل ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ مفروضہ صریحاً باطل ہے ورنہ حضرت نوح کا بیٹا مردود نہ ہوتا۔ العاقل تکفیہ الاشارہ۔

باز آمدم بر سر مطلب۔ چوتھی صدی میں تصوف کے چشمہ صافی کے مکدر ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ تصوف کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ جس زمانے میں اس تحریک کا آغاز ہوا، اسی زمانے میں غلاۃ شیعہ کی اسمٰعیلیہ تحریک عالم وجود میں آئی اور ان دونوں تحریکوں کی تدریجی ترقی ساتھ ساتھ ہوئی۔

سنہ ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں ہاشم کوفی نے صوفی کا لقب اختیار کیا ان کی وفات سنہ ۱۶۲ھ / ۷۷۸ء میں ہوئی ان کے بعد حسب ذیل افراد صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ابراہیم ادھم م سنہ ۱۶۱ھ / ۷۷۷ء، داؤد طائی م سنہ ۱۶۵ھ / ۷۸۱ء
فضیل ابن عیاض سنہ ۱۸۷ھ / ۸۰۳ء معروف کرخی م سنہ ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء

اسی زمانے میں یعنی دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں اسمٰعیلی تحریک کا ظہور ہوا۔ شیعوں کے چھٹے امام جعفر نے ۱۴۸ھ/۷۶۵ء میں وفات پائی اسی زمانے میں صوفی کا لقب ایجاد ہوا، اسی زمانے میں اسمٰعیلی تحریک وجود میں آئی۔ اسمٰعیلی مذہب کے بنیادی عقائد حسب ذیل ہیں (۱) حلول (۲) تجسم و تشبیہ (۳) رجعت (۴) تناسخ۔ یہ چاروں عقائد سراسر غیر اسلامی ہیں اور ایرانی باشندوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں کیونکہ یہ عقائد صدیوں سے ان میں مقبول تھے۔

اسمٰعیلی تحریک کو پروان چڑھانے والوں میں حسب ذیل اشخاص لائق تذکرہ ہیں :۔

(۱) المقنع (خراسان کا نقاب پوش مدعی نبوت) بقول ابن خلکان اس کا اصلی نام عطا تھا۔ باپ کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ابتدا میں یہ شخص مرو میں دھوبی تھا لیکن تھا پیدائشی ذہین۔ اس لئے اس نے سوچا کہ کپڑوں کے بجائے ایرانیوں کے قلوب کو کیوں نہ دھویا جائے۔ چنانچہ پہلے اس نے سحر و کیمیا و نیرنگ میں کمال حاصل کیا اس کے بعد اس نے ۱۶۴ھ/۷۸۰ء میں خدائی کا دعویٰ کر دیا کہ خدا مجھ میں بطریق تناسخ حلول کر گیا ہے یعنی سب سے پہلے خدا نے آدم میں حلول کیا۔ اُن کی وفات کے بعد نوح میں پھر عیسیٰ میں پھر ابومسلم خراسانی میں اور اب مجھ میں حلول کیا ہے۔ چونکہ وہ نہایت بدصورت اور کانا تھا اس لئے نقاب ڈالے رہتا تھا۔ یہ شخص غلاۃ شیعہ سے تعلق رکھتا تھا اور پہلا شخص ہے جس نے اسمٰعیلیت کو تقویت پہنچائی کیونکہ اسمٰعیلی خود بھی جعفر کے بیٹے اسمٰعیل کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے۔

یہ بات لائق غور ہے کہ تحریک تصوف کا آغاز اور المقنع کا خروج ایک ہی زمانے میں ہوا ہے۔

(۲) ابھی غلاۃ شیعہ (اسمٰعیلیہ) میں الوہیت کا دوسرا مدعی بابک خرمی تھا۔ اس نے ۲۰۱ھ/۸۱۵ء میں خروج کیا اور بیس سال تک ایران میں قیامت صغریٰ برپا رکھی اور سلطنت عباسیہ کے حکمرانوں پر خواب و خورش حرام کر دی۔ اس کے عقائد یہ تھے :

(ا) میں خدا کا اوتار ہوں۔ بعضوں سے کہتا تھا کہ میں مظہر الوہیت ہوں۔

(ب) میرے پیشوا جاویدان میں خدا نے حلول کیا اور اس کی وفات کے بعد اس کی روح مجھ میں حلول کر گئی گویا یہ شخص حلول تجسم اور تناسخ تینوں غیر اسلامی عقائد کی تبلیغ کرتا تھا۔ اسمٰعیلیہ بھی یہی عقائد رکھتے تھے اور بقول شہرستانی، تمام غلاۃ شیعہ، حلول، تجسم، تشبیہ، رجعت، اور تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ تصوف کی تحریک بھی اسی زمانے میں ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔

(۳) عبداللہ ابن میمون القداح۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اسمٰعیلی تحریک کو ایک سیاسی جماعت بنا دیا اور منصبانہ بنیادوں پر منظم کیا۔ حسن صباح نے اسی شخص کے لگائے ہوئے پودے کو پروان چڑھایا، اسی

نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ جعفر اور ان کے بڑے بیٹے اسمٰعیل دونوں فی الاصل خدا کے اوتار تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو کتاب الملل والنحل للشہرستانی صـ۱۳۶) عبداللہ کی وفات ۲۶۱ھ/۸۷۵ء میں ہوئی۔ اسی زمانے میں بایزید بسطامیؒ نے وفات پائی۔

القداح غیر معمولی تنظیمی اور تبلیغی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے مبلغین (دعاۃ) کی ایک جماعت تیار کر کے ایران کے تمام بڑے شہروں میں روانہ کی۔ کوفہ جو ۴۰ھ سے شیعیت کا مرکز تھا اسمٰعیلی تحریک کا مرکز قرار پایا۔ یہاں ایک شخص حمدان اشعث الملقب بقرمط رہتا تھا۔ یہ شخص القداح کا پُرجوش حامی بن گیا اور اس نے اسمٰعیلی تحریک کو اس جوش سے پھیلایا کہ اس تحریک کا دوسرا نام قرمطی تحریک پڑ گیا اور اسمٰعیلی قرامطہ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ انہوں نے سو سال تک (۲۷۸ھ/۸۹۰ء سے ۳۸۱ھ/۹۹۰ء تک) دنیائے اسلام کو تختۂ مشق ستم بنایا۔ سلاطین اسلام ان کے نام سے لرزہ بر اندام تھے۔ حجر اسود، بوسہ گاہِ خاص و عام، مرجع انام، بیس سال تک (۳۱۷ھ/۹۳۰ء سے ۳۳۹ھ/۹۵۰ء تک) زینتِ عنبہ قرامطہ بنا رہا۔ دنیائے اسلام کی بے کسی اور بے چارگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مسلمانان عالم نے حصول حجر اسود کے لئے دعوت مبارزت کے بجائے زر و جواہر کی پیش کش کی جو قرامطہ نے پائے حقارت سے ٹھکرا دی۔ دنیائے اسلام کے منہ پر یہ ایسا تھپڑ تھا جس کی چوٹ آج بھی محسوس ہو رہی ہے۔

ان قرامطہ نے اسمٰعیلی مذہب کے جو اصول و قواعد مدون کئے ان کی تفصیل اس جگہ درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنیادی اصول اربعہ —— حلول و تجسیم و رجعت و تناسخ ارواح —— جیسا کہ لکھ چکا ہوں چاروں سراسر کفر و الحاد و زندقہ ہیں۔ جو بات لکھنی چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ ان قرامطہ نے اپنے ان عقائد باطلہ کی ترویج کے لئے جہاں اور مختلف طور طریقے اختیار کئے وہاں بے چارے تصوف کو بھی اپنا آلہ کار بنایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ان دشمنانِ اسلام نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ اہلسنت والجماعت کے عوام کی عظیم الشان اکثریت اصول و فروع دین سے بیگانہ ہے اور شخصیت پرستی، اسلاف پرستی، آثار پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی، آل پرستی، روایات پرستی، اوہام پرستی اور اعجوبہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہے۔ صوفیوں کو فوق البشر سمجھتی ہے۔ ان کی کرامات کے افسانوں کو قرآن و حدیث سے بڑھ کر محبوب رکھتی ہے اور ہر اس بات پر جو کسی شیخ طریقت سے منسوب ہو بلا تحقیق و بلا چون و چرا ایمان لے آتی ہے۔ تقلید کور نے ان کے دل و دماغ کو اس قدر جامد اور ذوق تحقیق سے بیگانہ کر دیا ہے کہ ہر ناممکن بات دل و جان سے قبول کرنے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ اُسے چوتھی بیٹی، اس کے شوہر اور اس کے بیٹے سے منسوب کر دیا جائے ....

پس ان قرامطہ نے تصوف کا لباس زیب تن کیا۔ تقیہ کا عمامہ سر پر رکھا، سالوس کی مسند بچھائی نیاذی کے تکیے سے پشت لگائی اور مکر و فریب کا بازار گرم کر دیا اور اپنے عقائد مخصوصہ (حلول و تجسیم و تشبیہ و الوہیت علی وغیر ذلک) کو شیخ طریقت بن کر بھولے بھالے مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کرنا شروع کر دیا اور اس قسم کی "احادیث" بیان کر کے قلوب سامعین کو دیگر گوں بنا دیا "عن فلان ابن فلان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا و علیؓ من نورٍ واحدٍ" نیز یہ کہ "لا یعرف اللہ احدٌ من الناس الّا انا و علیٌ ولا یعرف علیًا احدٌ من الناس الا اللہُ وانا ولا یعرفنی احدٌ من الناس الا اللہُ و علیٌ"۔

چونکہ ان قرامطہ صوفیوں نے ساری عمر تقیہ کیا اس لئے کسی کو ان کے بارے میں کوئی شبہ لاحق نہ ہو سکا اور اس طرح انہوں نے ایک طرف اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عقائد (حلول، تجسیم، کفارہ) کی آمیزش کر دی۔ دوسری طرف لاکھوں جاہل اہلسنت کو گمراہ اور مشرک اور بدعتی بنا دیا اور بہت سے صوفیوں کو تشیع کی طرف مائل کر دیا اور اس فعل شنیع میں انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی یعنی سو سال کے اندر اندر انہوں نے تصوف میں اس قدر غلط عقائد داخل کر دیئے کہ طاؤس الفقراءؒ کو ان کی تردید میں ایک مستقل باب سپرد قلم کرنا پڑا۔

اس بات کا ثبوت کہ ان مصنوعی صوفیوں یعنی قرامطہ کی تلبیس سے بہت سے صوفی مائل بہ تشیع ہو گئے۔ عزّ الدین محمود بن علی کاشانی م ۷۳۵ھ کی تصنیف موسومہ "مصباح الہدایۃ و مفتاح الکفایۃ" سے مل سکتا ہے جسے عوام الناس عدم علم کی بنا پر "عوارف المعارف" کا فارسی ترجمہ سمجھتے ہیں۔ مصنف مذکور اس کتاب کے صفحہ ۹۴ پر لکھتا ہے :۔

"پس عقیدۂ صحیحہ سلیمہ آن است کہ ہمہ (صحابہ رضؓ) را دوست دارد و از ترجیح و تفضیل امساک کند و اگر در باطن او، از جہت فضیلت، محبت یکے راجح بود آنرا پنہاں دارد چہ بروئے اظہار آں واجب نیست۔ اما مشاجرتیکہ میان امیرالمومنین علی علیہ السلام و معاویہ افتادہ است اعتقاد کنیم کہ امیرالمومنین در اجتہاد خلافت محق و مصیب بود و مباشرت امر خلافت را مستحق و متعین بود و معاویہ مخطی و مبطل و مذنب و غیر مستحق " مَن یَّھدِ اللہُ فَھُوَ المُھتَدُ وَ مَن یُّضلِل فَلَن تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُرشِدًا " (منقول از کتاب مذکور صفحہ ۱۰۴ چاپ طہران شائع کردہ کتب خانہ سنائی)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا یا تو شیعہ تفضیلیہ ہے یا یقیناً مائل بتشیع ہے

بخوف طوالت اس عبارت پر نہایت مختصر انداز سے تنقید کرتا ہوں :۔

(۱) اہل سنت والجماعت کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہے کہ ترجیح و تفضیل سے باز رہنا چاہیئے۔ اس کے برعکس ہر سُنّی صاف لفظوں میں حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضؓ کو تمام صحابہ رضؓ پر تفضیل و ترجیح دیتا ہے اور اہل سنت کا ہر خطیب ہر جمعہ کو ہر مسجد میں یوں کہتا ہے :۔

"وعلی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق امیر المومنین سیدنا ابی بکر صدیقؓ"

جو شخص حضرت صدیق اکبر رضؓ کو افضل الصحابہ رضؓ تسلیم نہیں کرتا وہ ہرگز اہل سنت میں سے نہیں ہو سکتا۔ اہل سنّت کی تمام مستند اور متداول کتب عقائد و کلام میں بالتصریح مرقوم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضؓ بلاشبہ تمام صحابہ رضؓ سے افضل ہیں۔

(ب) محبت کو پنہاں رکھنا بھی کتمان و تقیہ و تشیع ہی کی ایک صورت ہے۔ اہل سنّت کو ان کے ائمہ نے بفحوائے نصوص یہ حکم دیا ہے کہ افضلیت صدیق اکبر رضؓ کی بنا پر اگر ان سے محبت ہو جائے اور وہ محبت دوسروں کی محبت پر غالب آجائے (راجح ہو جائے) تو اس کا برملا اظہار کرے تاکہ مومنوں کے ازدیاد ایمان کا موجب ہو۔ پوشیدہ رکھنا تو اہل تشیع کا مسلک یا مشرب خاص ہے۔ اہل سنت تو اپنے عقائد کا ببانگ دہل اعلان کرنے پر مامور ہیں۔

(ج) جیسا کہ اوپر بیان ہوا افضلیت صدیق اکبر رضؓ کا اعلان کرنا اہل سنّت پر واجب ہے۔

(د) مصنف نے حضرت علی کے نام کے آگے "علیہ السلام" لکھا ہے اور نہ حضرت معاویہ رضؓ کے نام سے پہلے تعظیمی لفظ لکھا ہے نہ بعد میں رضی اللہ عنہ" لکھا ہے۔ یہ فعل بھی اہل سنّت کا نہیں ہو سکتا کیونکہ علمائے اہل سنّت حضرت علی کے نام کے آگے "علیہ السلام" نہیں لکھتے اور حضرت معاویہ کے نام کے آگے "رضی اللہ عنہ" لکھتے ہیں۔ حضرت علی کے نام کے آگے یا کرم اللہ وجہہ لکھتے ہیں یا رضی اللہ عنہ"

(ہ) اہل سنت کا کوئی امام یا عالم حضرت معاویہ رضؓ کو مذنب نہیں کہتا۔ بعض نے انہیں "مخطی" لکھا ہے مگر یہ خطا محض خطا اجتہادی تھی جس کا مرتکب مذنب یا مرتکب ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ بقول ائمہ اہل سنت مجتہد اگر مصیب ہو تو دگنا ثواب ملے گا اور اگر مخطی ہو تو مصیب کے مقابلے میں نصف کا مستحق ہو گا۔

(و) جو آیت لکھی ہے وہ بھی حضرت معاویہ رضؓ سے عناد قلبی پر دال ہے کوئی اہل سنت اس طرح تعریض نہیں کر سکتا کیونکہ حضرت معاویہ رضؓ کا شمار جلیل القدر صحابہ رضؓ میں سے ہے۔ اور حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں ہادی اور مہدی ہونے کی دعا فرمائی ہے اور ہر مسلمان یقین رکھتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دعا رد نہیں ہو سکتی پس یقیناً حضرت معاویہ رضؓ ہادی اور مہدی ہیں اور ان سے بغض رکھنے والا دائرہ اہل سنت سے خارج ہے۔

فی الجملہ میں نے اپنا دعویٰ بشواہد معتبرہ ثابت کر دیا کہ فرقہ باطنیہ یا قرامطہ نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر (۱) اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عقائد داخل کر دیئے اور (۲) لاکھوں مسلمانوں کو گمراہ کر دیا

اللھم احفظنا من شرور انفسھم وخبث بواطنھم۔

تاریخ اسلام کے دورِ فتن

کے بارے میں ایک انتہائی یک رخا نقطۂ نظر وہ ہے

* جسے ایک خاص گروہ نے نہایت اہتمام کے ساتھ ایک ہزار برس کی مسلسل اور پیہم کوشش سے زبان زد خاص و عام کر دیا ہے ——— اور

* جسے حال ہی میں مودودی صاحب کی تالیف "خلافت و ملوکیت" سے نمایاں تقویت حاصل ہوئی ہے

——— خدا کا شکر ہے کہ ———

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ

کے مصداق اس دور میں اس زہر کا تریاق بھی مہیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ : ———

علامہ محمود احمد عباسی

نے اپنی متعدد تصانیف کے ذریعے "تصویر کا دوسرا رخ" بھی پیش کر دیا ہے جن میں سے اصل بنیادی تصنیف پر تو "کہ سنگ و خشت میں مقید ہیں..." کے مصداق پابندی ہے تاہم ان کی درج ذیل تصانیف کے مطالعے سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱) تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہؓ و یزید: بڑے سائز کے ۴۰۵ صفحات مجلد، قیمت ۸ روپے

(۲) حقیقت خلافت و ملوکیت : بڑا سائز۔ ۵۶۲ صفحات، قیمت سفید کاغذ -/۱۱ نیوز پرنٹ ۹/۷۵

(۳) وقائع زندگانی اُمِّ ہانی رضؓ : قیمت : -/۳ روپے

ملنے کا پتہ:—

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور

غزل

پروفیسر محمد منوّر

یاروں کی عنایات کا چرچا نہ کریں گے — اے اہلِ وفا ہم کبھی لب وا نہ کریں گے

برہم ہیں اشارے پہ وہ ایما پہ ہیں ناراض — ہم ان کو غزل اپنی سنایا نہ کریں گے

دیکھو جسے دعویٰ محبّت ہے زباں پر! — بندے جو محبّت کے ہیں دعویٰ نہ کریں گے

ارباب محبّت کی ہے خاطر شکنی جرم! — ارباب محبّت کبھی ایسا نہ کریں گے

کیجو تو سہی ہم سے کوئی وعدۂ جانساز — وعدہ رہا ایفا کا تقاضا نہ کریں گے

رودادِ جنوں اپنی سنانی ہے جہاں کو — لیکن نہ کیا ذکر تمہارا نہ کریں گے

وہ سجدہ کہ ہو مایۂ بازارِ ریائی — یارب نہ کیا ہم نے وہ سجدا نہ کریں گے

یاروں کے مخالف ہو گواہی تو منوّر!
ہم آنکھوں پہ کانوں پہ بھروسا نہ کریں گے

ایک اہم اعلان

آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہ

کی ایک اہم تحریر، مشتمل بر:

ا۔ اعترافِ تقصیر: یعنی مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شان میں سرزد شدہ گستاخیوں پر اظہارِ ندامت اور

ب۔ اظہارِ حقیقت: یعنی نفرت بر ملت و قومیت پر علامہ اقبال مرحوم اور حضرت مدنیؒ کے مابین غلط فہمی اور اس کے ازالے کی تفاصیل۔ (مدیر)

ایک فکر ——— ایک تحریک ——— ایک جہاد

——— علمی و دینی مجلہ ———

ماہنامہ **الحق** مدیر: مولانا سمیع الحق

جو پچھ سال سے باقاعدگی کے ساتھ لادینی کے ہر محاذ پر برسرِ کار ہے

- علمی و دینی اور اصلاحی مضامین
- تحقیقی مقالے
- پُر مغز اداریے
- معیاری ادبیات
- سنجیدہ تنقیدیں
- باطل کا تعاقب
- مغربی اور ہر لادینی تحریک کا پوسٹ مارٹم
- تاریخ، سائنس، مواعظ اور تصوف
- قانون، سیاست
- قرآن اور اسلامی معاشرہ کی حسین تصویر
- فرق باطلہ کا علمی احتساب
- اس کے ہر شمارے کی امتیازی شان ہے
- نئے حالات اور نئے مسائل پر اسلام کی ترجمانی۔

الحق ملک و بیرونِ ملک مسلمانوں کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول ہے جس کی افادیت وقتی نہیں بلکہ حال اور مستقبل میں ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

الحق عالم اسلام کے پیدہ فکری اور علمی صلاحیتوں کا نچوڑ ہے۔

سفید کاغذ، معیاری کتابت و طباعت، دو رنگ آرٹ پیپر کا حسین ٹائیٹل

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے، سالانہ آٹھ روپے، غیر ممالک عام ڈاک سے ایک پونڈ

ماہنامہ الحق، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ضلع پشاور، مغربی پاکستان

فہرست مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

***

۱- 'مبادی تدبر قرآن' تالیف مولانا امین احسن اصلاحی (زیر طبع)

۲- 'دعوت دین اور اس کا طریق کار' ,, قیمت -/۵

۳- 'تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ'

تالیف ڈاکٹر اسرار احمد قیمت -/۴

۴- 'اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدعا اور طریق کار' تالیف،

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) ایم-اے-پی-ایچ-ڈی-ڈی لٹ

قسم اعلیٰ قیمت ۱/۵۰

قسم ادنیٰ قیمت -/۸

۵- 'اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام' تالیف ڈاکٹر اسرار احمد قیمت -/۱

۶- 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' ,, قیمت -/۱

۸- 'قرآن اور امن عالم' ,, قیمت -/۵۰

۹- 'اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار'

تالیف مولانا امین احسن اصلاحی -/۵۰

۷- 'قرآن اور پردہ' ,, قیمت -/۶۰

●●●

Regd. No, L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 18. | APRIL 19`1 | No. 3-4

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول

مشتمل بر مقدمہ و تفاسیر آیتہ بسم اللہ ، سورۂ فاتحہ ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران

سائز ۸/۲۹ x ۲۲ ، صفحات ۸۸۰

عمدہ دبیز سفید کاغذ ...... آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

جلد دوم

مشتمل بر تفاسیر سورۂ نساء ، سورۂ مائدہ ، سورۂ انعام ، سورۂ اعراف

سائز ، کاغذ ، طباعت اور جلد حسب سابق' صفحات ۸۰۸۔پریس میں جاچکی ہے

ھدیہ فی جلد ۳۰/- ۔ محصولڈاک و پیکنگ ۳/-

(پینتیس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ۔ وی۔پی۔پی طلب کرنے کی صورت میں

دس روپے پیشگی ارسال کریں)

... شائع کردہ ...

دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور۔۱ (فون 69522)

پبلشر : محی الدین ۔ طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ لاہور